اے بی سی آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

ماھنامہ

الحق

اکوڑہ خٹک

جلد ۲۴
شمارہ ۹

ذیقعدہ : ۱۴۰۹ ھ
جون : ۱۹۸۹ء

بیاد
حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مدیر معاون : عبدالقیوم حقانی

مدیر
حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ العالی
ناظم : شفیق فاروقی

فون نمبر ڈائریکٹ ڈائلنگ سسٹم ۳۴۰ / ۳۴۱ / ۴۳۵ کوڈ نمبر ۰۵۲۳۱۷

اس شمارے کے مضامین

پاکستان میں سالانہ -/۵۰ روپے فی پرچہ -/۵ روپے بیرون ملک بحری ڈاک -/۸ پونڈ بیرون ملک ہوائی ڈاک -/۱۲ پونڈ
سمیع الحق استاذ دارالعلوم حقانیہ نے منظورِ عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "الحق" دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

○ افغانستان اور بھارت کے متعلق تبدیل پذیر خارجہ پالیسی ملک وملت کیلئے مہلک ہے

○ افغان جہاد ــــ بھارت کی بالادستی شمالی علاقہ جات
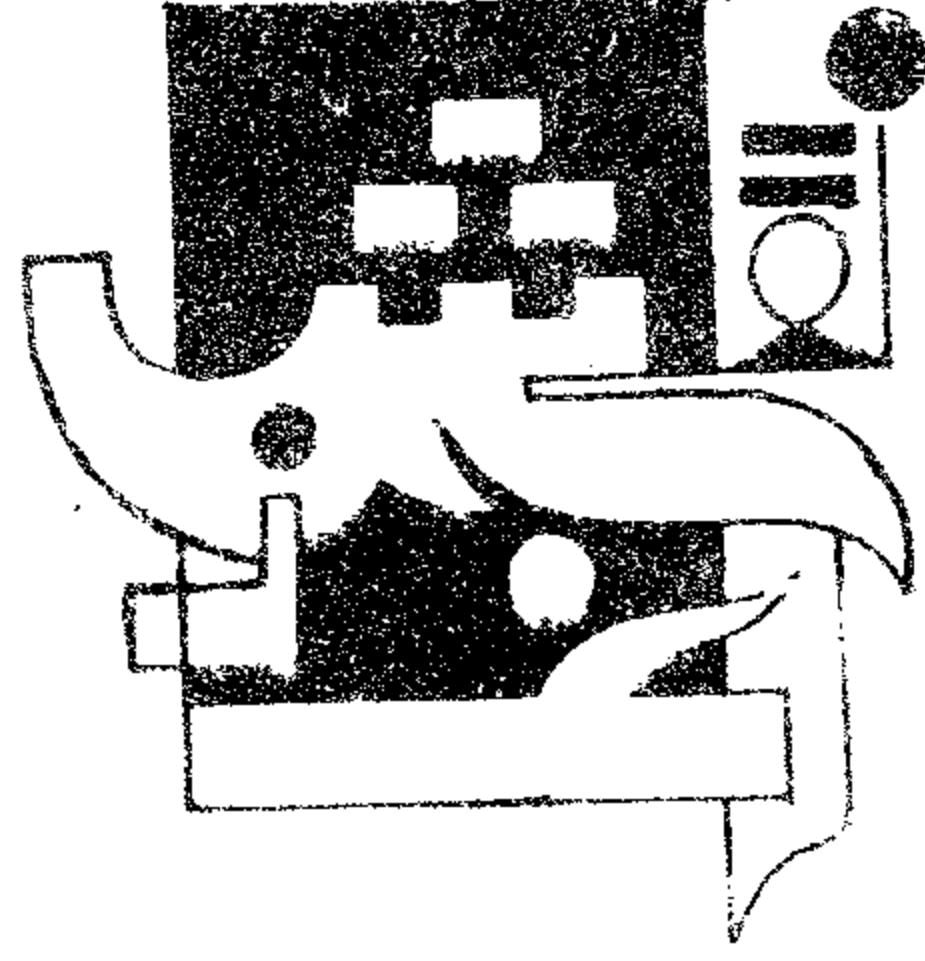
۲۳ مئی ۱۹۸۹ء کو سینٹ میں خارجہ امور پر بحث کے دوران مولانا سمیع الحق مدظلہ نے مختصر خطاب میں اہم مسائل پر روشنی ڈالی جو سینٹ کے ضبط کردہ شکل میں پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

مولانا سمیع الحق | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ــــ ایک بہت اہم مسئلے پر ایوان میں اظہار خیال ہو رہا ہے، اور ہم آپس میں تو یہ سب کچھ کہتے رہتے ہیں، اصل مقصد یہی تھا کہ حکومت کی ہائی کمان تک ہماری باتیں اور گذارشات پہنچ جائیں، اور چاہیئے یہ تھا کہ وزیر اعظم صاحبہ جو اس وقت بعض پالیسیوں میں تبدیلی رونما ہونے والی ہے یا ہو رہی ہے خود وزیر اعظم صاحبہ اس ایوان میں موجود رہتیں اور خارجہ پالیسی کے بارے میں ایوان کے ارکان کے خیالات سنتیں۔ مگر بد قسمتی سے معلوم نہیں ہے کیوں اس ایوان سے ان کو الرجی ہے کہ وہ سوائے چارمنٹ کے اب تک ان چھ سات مہینوں میں اس ایوان میں تشریف نہیں لا سکیں۔ تو یہ براہ راست ان کے سننے کی باتیں تھیں۔ دوسرے مرحلے پر آپ نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ دن طے کیا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ اس پر گفتگو رہی تھی کہ وزیر خارجہ صاحب کب دستیاب ہوں گے۔ تو جناب وزیر خارجہ تشریف بھی لے آئے لیکن وہ ایوان میں ہمارے خیالات سننے کے لیے موجود نہیں ہیں نہ ان کے جو نمائندہ ہیں جو آپ فرماتے ہیں کہ وہ نوٹ لکھیں گے، وہ بھی کچھ دیر ایسے خاموش گپ شپ لگا رہے تھے پھر چلے گئے۔

جناب چیئرمین | نہیں نہیں نمائندے موجود ہیں۔

مولانا سمیع الحق | تو یہ ایک عجیب صورتحال ہے، میں سمجھتا ہوں کہ صاحبزادہ یعقوب صاحب کو جان بوجھ کر بالکل لاتعلق رکھا جا رہا ہے، اور وہ ایوان میں بھی آج اس لیے نہیں ہیں کہ وہ ہمارے خیالات نہ سن سکیں اور ہم، یہ

محسوس ہو رہا تھا۔

جناب چیئرمین: ڈاکٹر صاحب نوٹس لے رہے ہیں اور ان کو پہنچا دیں گے۔

مولانا سمیع الحق: بہرحال ہم پہلے بھی محسوس کرتے تھے کہ جناب وزیر خارجہ صاحب کو خارجہ پالیسی سے بالکل الگ تھلگ رکھا جا رہا ہے اور اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ آج اس بحث کو سننے کے لیے بھی ان کو وقت نہیں مل سکا ہے۔ وہ کابینہ کی میٹنگ میں بڑا اہم مسئلہ ہوگا مگر میرے خیال میں قوم کی سالمیت اور ملکی دفاع کے تقاضے ملک کو درپیش ہیں، تو یہاں ان کو بہرحال موجود رہنا چاہیے تھا۔

مسئلہ افغانستان اور جنیوا معاہدہ کے نتائج: اس وقت اہم ترین مسئلہ جو فوری طور پر توجہ طلب ہے وہ افغانستان کا ہے، اس پر میں چند منٹ گذارش کروں گا۔

جناب والا ہم نے بڑے اخلاص سے بڑی دلسوزی سے جنیوا معاہدہ کے وقت یہ سارے خدشات ظاہر کیے تھے اور ہم نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اور سینٹ اجلاس میں بھی جنیوا معاہدہ کی شدید مخالفت کی تھی۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم اپنے آپ کو ایک فریق اور جارح بنا رہے ہیں جبکہ پاکستان اس مسئلے میں فریق نہیں تھا۔ یہ روس اور مجاہدین کا مسئلہ تھا یا نجیب اللہ اور مجاہدین کا مسئلہ تھا، لیکن پاکستان نے اپنے آپ کو فریق بنا لیا اور روس کو جج تسلیم کر لیا، جارح کو منصف کا مقام دے دیا۔ پھر ہم نے کہا کہ اس جنیوا معاہدے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا اور مہاجرین واپس نہیں جائیں گے اور جنگ کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا، وہ ساری صورتِ حال ہو بہو ہمارے سامنے آگئی، روس نے بظاہر بوریا بستر لپیٹ لیا اس نے دنیا میں نیک نامی تو حاصل کر لی لیکن وہ اپنی پوری قوت اور تشدد اور اسلحہ کے ساتھ اب بھی افغانستان میں موجود ہے اور اس ساری لڑائی اور جنگ وجدال کی ذمہ داری وہ پاکستان کے سر پر تھونڈھ رہا ہے اور دنیا بھر میں ایک واویلا مچا ہوا ہے کہ پاکستان جارحیت کر رہا ہے ـــــ تو ہم نے جو خدشات ظاہر کیے تھے وہ من وعن ثابت ہو رہے ہیں۔ ہم ۵ لاکھ یا ۳۰ لاکھ مہاجرین کو ان حالات میں یہاں سے اٹھا کر افغانستان میں پھینک تو نہیں سکتے نہ ہم مجاہدین سے اپنی مرضی منوا سکتے ہیں کہ وہ جیتی ہوئی جنگ ہار دیں اور اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں اور جہاد ختم کر دیں اس صورتحال میں معاہدہ جنیوا کی وجہ سے ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔

مجاہدین سے غداری کی پالیسی: دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے موجودہ صورتحال میں جو فتح حاصل کی تھی اس فتح کو شکست میں تبدیل کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں، یہ صرف اس ملک کے ساتھ نہیں بلکہ تاریخ کی دی گئی عظیم ترین قربانیوں کے ساتھ غداری ہوگی کہ ہم نے پہلے تو مجاہدین کی نصرت کی، انصار کے جذبے کا مظاہرہ کیا اور پاکستان نے تاریخ میں ایک بے مثال کردار ادا کیا آزادی کے لیے جنگ لڑنے والی ایک مظلوم قوم کے لیے۔ لیکن عین وقت پر جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے قریب ہو گئے ہم نے اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنے کی پالیسی اختیار کر لی ہے۔ اب جو صورتحال سامنے آرہی

ہے اور ہماری تبدیل شدہ پالیسی کو بھارت بھی تحسین کی نظر سے دیکھ رہا ہے اور امریکہ بھی اس کی تعریف کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بے وجہ نہیں ہے۔ کل "ٹائمز آف انڈیا" نے تفصیل سے ایک اداریہ لکھا ہے جو جنگ اخبار نے بھی نقل کیا ہے، اُس نے لکھا ہے کہ "اب افغانستان کے سلسلے میں موجودہ حکومت کی پالیسیاں بہت بہتر ہوتی جا رہی ہیں اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان کی پالیسی حقیقت پسندی کی طرف جا رہی ہے۔" اور امریکی سفیر نے بھی یہی الفاظ کہے ہیں کہ "بے نظیر کی پالیسیاں افغانستان کے سلسلے میں بہتر ہوتی جا رہی ہیں"۔ ان سب باتوں کی وجہ یہ ہے کہ اس آخری مرحلے پر روس، امریکہ اور بھارت تینوں اس پر متفق ہیں کہ افغانستان میں جیتی ہوئی جنگ سے اسلامی قوتوں کو کہیں فائدہ نہ پہنچے، وہاں مجاہدین کی حکومت قائم نہ ہو، امریکہ کی دلچسپی صرف روس کے واپس جانے اور پسپا کرنے سے تھی اور بظاہر روس چلا گیا اور اب امریکہ نہیں چاہتا کہ وہاں مجاہدین کی حکومت یا ایسی حکومت جو مستحکم حکومت اسلام کی بنیادوں پر قائم ہوگی، علی الاعلان بیشواہد اور ثبوت موجود ہیں کہ امریکہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے، روس کے ساتھ اس معاملہ میں وہ مفاہمت کر چکا ہے، ٹھیک آپ (روس) چلے جائیں لیکن ان (مجاہدین) کے قدم ہم نہیں جمنے دیں گے ___ اور جب مجاہدین کی اسلامی حکومت قائم ہوگی تو وہ پاکستان کی مغربی سرحد کے لیے ایک آہنی اور فولادی حصار ثابت ہوگی اور پاکستان کو ان مجاہدین اور اُن کی حکومت کی وجہ سے مغربی سمت سے کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ تو راجیو گاندھی اس چیز کو سمجھ چکا ہے، اب وہ ہر حالت میں چاہتا ہے کہ یہ آہنی اور فولادی حصار مغرب میں پاکستان کو مہیا نہ ہو۔

وسیع تر حکومت کی سازش کیوں؟

اور جو روس کے گماشتے ہیں اور سامراجی ہیں اُن کو کسی نہ کسی طرح حکومت میں شریک کرایا جائے، اور وسیع تر حکومت کی بات کل بھی وزیرِ خارجہ صاحب نے فرمائی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ افغانستان کا اندرونی ہے ہم کون ہوتے ہیں کہ یہاں سے ان کے بارے میں فیصلے کریں کہ ان کو وسیع تر حکومت بنانی چاہیئے۔ افغانستان روس نے چھین لیا تھا اور سامراج نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنے ایجنٹوں کو اس نے ٹینکوں پر بٹھا کر افغانستان میں بھیجا مگر مجاہدین ڈٹ گئے اور ایمان کی قوت سے انہوں نے افغانستان کو چھڑایا اور روس کو ذلیل کر کے پسپا کیا ___ اب جن لوگوں نے روس کی خاطر ۱۶ لاکھ افراد کو قتل کیا، ۵ لاکھ افراد کو ملک سے باہر پھینکا اور سارے ملک کو تہس نہس کر کے رکھ دیا، اب ان قاتلوں کے بارے میں ہمیں فکر ہے کہ ان کو بھی جہاد کے مالِ غنیمت میں حصہ ملے۔ قاتل کو ہم حصہ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ جبکہ وسیع تر حکومت کا مقصد یہی ہے کہ کسی طرح روس کے ایجنٹوں کو بھی اس میں یا جو روس کے زمانے میں جہاد سے بھاگے یا جو بھگوڑے تھے اور باہر یورپ وغیرہ بھاگ چکے تھے، اُن کو بھی لا کر مجاہدین کے ساتھ بٹھایا جائے۔ وہ قاتل بھی مقتولوں کے ساتھ اور ۱۶ لاکھ افراد کو قتل کرنے والے بھی مظلوموں کے ساتھ اس میں شریک ہو جائیں ___ تو یہ ہم کون ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں فیصلہ کریں یہ فیصلہ ہم مجاہدین کا کیوں نہیں مانتے؟

عبوری حکومت تسلیم کرنے میں پس وپیش

ہم پہلے مختلف رکاوٹیں ڈال رہے تھے، پھر دنیا میں یہ مسئلہ اٹھایا کہ افغان مجاہدین کسی عبوری حکومت پر متفق نہیں ہیں، وہ عبوری حکومت بنا ہی نہیں سکتے۔ مگر انہوں نے تمام سازشوں کو ناکام بنا کر کن کن مشکلات سے گذر کر (مجھے اس کا اندرونی پتہ ہے) کہ وہ ایک کمرے میں بیٹھ کر سارے اختلافات کو بالائے طاق رکھ رکھ کر ایک ڈھانچہ تشکیل دینے پر متفق ہو گئے، انہوں نے دنیا کا سارا پروپیگنڈہ ختم کرا دیا کہ ہم متفق نہیں ہو سکتے، انہوں نے عبوری حکومت قائم بھی کر لی۔ اب ہم مسائل پیدا کر رہے ہیں کہ دنیا اس کو تسلیم کرے گی نہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ دنیا تسلیم کرتی یا نہ کرتی، جس جذبے سے ہم نے آٹھ سال ان کے ساتھ تعاون کیا، ان کو پناہ دی اور اس جنگ کو، آزادی کی جنگ کو پاکستان کو سرخرو کر دیا، ساری اقوامِ عالم سے ہم نے تائید حاصل کی، پہلے ہی دن ہم اسے تسلیم کر لیتے دنیا ہمارا انتظار کر رہی تھی کہ یہ تسلیم کریں گے، جب گھر کا معاملہ ان کا ہے جب یہ تسلیم نہیں کرتے تو ہمیں کیا پڑی ہے۔ اور یہ پالیسی اگر تبدیل نہ ہو چکی ہوتی اور ضیاء الحق مرحوم اگر زندہ ہوتے تو میرے خیال میں پہلے ہی دن یہاں سے آواز آتی۔ مجھے پریشانی تھی وہاں علماء آئے ہوئے تھے، سعودی عرب کے بہت ممتاز علماء وہ ہمارے ہاں بیٹھے ہوئے تھے، بڑے اونچے طبقے کے وہ لوگ ہیں، اور اتفاقاً ان کو ٹیلیفون آیا، سعودی عرب سے تین بجے اعلان ہو گیا کہ سعودی حکومت نے افغان عبوری حکومت کو تسلیم کر لیا ہے، تو خوش ہونے کی بجائے انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہا، میں نے پوچھا یہ کیوں؟ انہوں نے کہا ہم یہ اعزاز پاکستان کا دیکھنا چاہتے تھے ہمیں دکھ ہے کہ پاکستان پہلے نمبر پہ نہ آیا۔ ہمارے ملک نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ یہ مسئلہ پاکستان کا ہے۔ پھر دوسرے دن بحرین نے بھی تسلیم کر لیا، سوڈان اور ملائشیا نے بھی تسلیم کر لیا، اسلامک تنظیم نے بھی ان کو سیٹ دے دی، لیکن ہم ہیں کہ اب جلال آباد کو اچھالنے لگے ہیں۔ ۸۵ فیصد علاقے پر ان کا قبضہ ہے، عملاً مکمل قبضہ ہے سوائے چند شہروں کے، جبکہ چھ چھ سات سات مہینے ان کا پہلے بھی محاصرے رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے، خوست کے محاذ پر کئی کئی مہینے ڈٹے رہے بالآخر کامیابی ان کو حاصل ہوئی کچھ ایسے عوامل آئے ہیں کہ روس جلال آباد کے مسئلے کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے اور اس کے سیاسی مقاصد ہیں۔ کہ لوگ کہتے تھے کہ میں (روس) وہاں تھا اب تو میں نہیں ہوں، یہ ساری مصیبت ان کی اپنی ہے، وہ سیاسی سٹنٹ بنا کر اس مسئلے کو پیش کر رہا ہے وہ ایک معمول کی لڑائی ہے اور پورے افغانستان کے محاذوں پر جنگ جاری ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب یہ فتح ہو گا تب تسلیم کریں گے، پھر کہیں گے کہ کابل فتح ہو گا تب تسلیم کریں گے۔ حالانکہ یاسر عرفات تو مراکش میں بیٹھا ہوا ہے یہ اچھی بات ہے کہ ہم نے اس کی ہوائی حکومت تسلیم کر لی۔ ہم فلسطین سے ہزاروں میل دور اس کی حکومت کو تسلیم کر سکتے ہیں جبکہ فلسطین کی ایک انچ زمین پر ان کا قبضہ نہیں ہے ان کی حکومت نہیں ہے، لیکن افغان عبوری حکومت کے لیے ہم کہتے ہیں کہ وہ پورا قبضہ حاصل کریں گے تب تسلیم کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ پھر آپ کے تسلیم کرنے کی کیا ضرورت ہو گی۔ اب بھی مجاہدین کہتے ہیں، اس کے صدر نے مجھے کہا

جب اللہ تعالیٰ ہمیں تسلیم کر چکا ہے تو انہیں کسی کے تسلیم نہ کرنے کی کیا پرواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ روس کو ذلیل کرا کے ان کو تسلیم کر چکا ہے۔

تو میری گذارش یہ ہے کہ کل وزیر خارجہ صاحب نے یہ کہا کہ وقت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ وقت حالات بگاڑ بھی سکتا ہے۔ یہ جتنی قربانیاں ہم نے دی ہیں یہ ضائع بھی کی جا سکتی ہیں، پھر ہم کفِ افسوس ملتے رہیں گے پھر انہوں نے یہ اشارہ بھی کیا کہ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات مستحکم ہوتے جائیں گے۔ تو کیا ہم نے نجیب اللہ گورنمنٹ کو تسلیم کر لیا ہے؟

تو ایک تو اس حکومت کو فوری تسلیم کرنا چاہیئے۔ اگر تسلیم نہ کیا گیا تو اس میں نقصان یہ ہوگا کہ ہمیں بہت بڑی ہمدردیاں افغان قوم اور مجاہدین کی حاصل ہوئی ہیں، ایک لازوال رشتہ میں ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں، اتنی عظیم قربانیوں سے یہ محبت اور یہ تعلق جو ہے وہ موجودہ پالیسیوں کی وجہ سے کہیں نفرت میں تبدیل نہ ہو جائے، جو قوت ہمیں حاصل ہو چکی ہے وہ ہم گنوا نہ بیٹھیں۔

غیر منصفانہ پالیسی | اور اسی پالیسی کا عجیب مظاہرہ ہے: ہم نے پاک افغان سرحد پر تو امن چوکیاں قائم کر لیں، یہ کتنا ظالمانہ اور یکطرفہ فیصلہ ہے۔ ہم نے پاکستان کی افغانستان سے جہاں سرحدات ملتی ہیں وہاں اقوام متحدہ کی امن چوکیاں قائم کر لی ہیں جبکہ ہم اور وہ دو دوست تھے۔ لیکن روس کے ساتھ جو سرحدات ملی ہوئی ہیں وہاں کوئی امن چوکی قائم نہیں ہے، وہاں سے دھڑا دھڑ اسلحہ کے کنوائے آرہے ہیں۔ دریائے آمو کے ساتھ ایک بندرگاہ ہے کہتے ہیں کہ دن رات اس پر اسلحہ کے کنوائے آرہے ہیں اور کابل ائیرپورٹ پر روزانہ اسلحے کے بھرے ہوئے جہاز اتر رہے ہیں لیکن وہ سرحد بالکل کھلی ہوئی چھوڑ دی گئی ہے۔ جو دو دشمنوں کے درمیان سرحد ہے وہاں تو امن کی ضرورت نہیں ہے اور دو دوستوں کے درمیان امن چوکیاں قائم کرنا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے مجاہدین کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے کہ وہ تو آ جا بھی نہیں سکیں گے اور وہ کوئی اسلحہ وغیرہ بھی نہیں لے جا سکیں گے، تو پھر واضح اعلان کر دیجئے، مجاہدین کو اٹھا کر ان کے ملک میں پھینک دیجئے، میرے خیال میں اتنی زمین ان کی وہاں بھی ہے۔

تو یہ صورتحال میں جو بالکل تبدیلی رونما ہونے والی ہے اس کا نوٹس لینا چاہیئے اور یہ پالیسی تبدیل نہیں ہونی چاہیئے۔

بھارت کی بالادستی | جناب والا! میری دوسری گذارش یہ تھی کہ یہاں ہمیں عالمی طور پر محسوس ہو رہا ہے کہ بھارت کی بالادستی کے منصوبے جو ہیں وہ پورے کیے جا رہے ہیں۔ موجودہ تبدیلی کو بھی ہم اس منصوبہ کا حصہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو بھارت کا مکمل زیر دست بنایا جائے۔ ابھی ہمیں کل صاحبزادہ صاحب نے مژدہ سنایا تھا کہ راجیو گاندھی اور بے نظیر کے درمیان سارک کے موقع پر مفید مشورے ہوئے تھے، لیکن یہ مفید مشورے قوم کے بار بار مطالبہ کے باوجود نہ ایوان کے سامنے رکھے

اور ان کو قوم کے سامنے رکھا۔ تفصیل کے ساتھ صاحبزادہ صاحب نے اس پر روشنی ڈالی۔ سارک میں ہم اس کے لیے لگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان نے سری لنکا اور مالدیپ میں مداخلت کی اور ہم خاموش رہے، اب وہ نیپال کو سزا دے رہا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی ایک شخص کی جان خطرے میں ہو اور اس کو ایک ریوالور کی ضرورت ہو لیکن اس کو ریوالور بھی نہ دیا جائے۔ بھارت اُس کو اس بات کی سزا دے رہا ہے کہ تم نے ریوالور کیوں مانگا ہے، تمہیں ریوالور کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں اپنے جان و مال کا تحفظ پہلے کس نے دیا ہے؟

تو میں عرض کرتا ہوں کہ سارک کس مرض کی دوا ہے؟ ان امور پر پاکستان کیوں خاموش ہے۔ یہ سارک اگر سارک بھلی ہے تو اس پر لعنت بھیجنا چاہیئے، اس سے الگ ہونا چاہیئے۔ صرف جلسوں، استقبالیوں اور انتظامات کے لیے ہی سارک بنی ہوئی ہے؟

شمالی علاقہ جات | جناب والا! پاکستان کے شمالی علاقہ جات جو ہیں اُن پر بھی خطرات کے سائے منڈلا رہے ہیں اور بیرونی قوتیں اپنے مقاصد کیلئے شمالی علاقہ جات کو الگ تھلگ کرنے کے منصوبے بنا رہی ہیں، یہ منصوبے پاکستان کے لیے نہایت ہی خطرناک ہیں اگر اس کو ایک الگ صوبے کی شکل دی گئی تو کشمیر کا مسئلہ بالکل ختم ہو جائے گا اور آئندہ اسی صوبے کو جس طرح بنگلہ دیش کی صورت میں مشرقی پاکستان کو الگ کیا گیا، اسی طرح اسے بھی الگ کر کے فرقہ وارانہ بھٹی میں جھونک دیا جائے گا اور وہاں لبنان جیسی کیفیت مستقل جاری رہے گی۔ بعض عالمی قوتیں ایک ایسے علاقے میں جو پانچ بین المملکتی سرحدات سے ملا ہوا ہے، یہ کہ بھارت سے، چین سے، روس سے، افغانستان سے اور پاکستان سے، وہاں پھر ایک ایسی چیز بن جائے گی جیسے اسرائیل عالم عرب کیلئے ناسور بنا ہوا ہے۔ یہ الگ تھلگ صوبے کی آواز بظاہر تو حقوق کی آواز ہے لیکن یہ ہے بڑی خطرناک آواز۔ ہم چار پانچ سال سے اس طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ایسی سازشیں تیار ہو رہی ہیں۔

جناب والا! جہاں تک حقوق کا مسئلہ ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ شمالی علاقہ جات کے لوگوں کا حق متعین ہونا چاہیئے۔ جب وہ آزاد کشمیر کا جغرافیائی، آئینی اور تاریخی حصہ ہے تو ان کو باقاعدہ آزاد کشمیر اسمبلی میں فوراً نمائندگی دینی چاہیئے، اس کے ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ سے فوراً ان کو وابستہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنے حقوق کے لیے لڑ سکیں۔

ایٹمی پروگرام | جناب والا! ایٹمی پروگرام کے بارے میں موجودہ حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد کچھ عجیب باتیں سامنے آ رہی ہیں بعض ذمہ دار لوگوں نے کہا تھا کہ ایٹمی پروگرام کا سارا سلسلہ روک دیا گیا ہے، اس کی پوری وضاحت قوم کے سامنے ہونی چاہیئے کہ کیا واقعی ایٹمی پروگرام کا سلسلہ روک دیا گیا ہے اور وہاں کام ختم کرا دیا گیا ہے۔ اسکے بارے میں واضح کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں آئی۔ ہماری گذارش ہے کہ ہمیں ہر حال میں اپنے ایٹمی پروگرام کو جاری رکھنا چاہیئے۔ یہ انرجی کا پروگرام اس دباؤ میں نہ ہوتا، ہم روس، امریکہ اور بھارت کے دباؤ میں نہ آئے ہوتے تو آج نہ یہ لوڈشیڈنگ ہوتی اور نہ یہ مشکلات ہوتیں۔ اگر ہم نے ایٹمی انرجی حاصل نہ کی تو شاید ہم دو تین صدیاں پیچھے چلے جائیں گے اور دنیا کی دوڑ کے ساتھ ہم بالکل شریک نہیں ہو سکیں گے۔ ☆☆

مولانا رضاء الحق : از دار العلوم زکریا
لینیشیا جوہانسبرگ ۔ جنوبی افریقہ

حضرت شیخ الحدیثؒ
ایک جامع شخصیتؒ

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام   بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

سیدی شیخ الحدیث محبوب الانام جامع العلوم ۔ پیکر صدق و وفا ۔ مجسم تواضع حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعلی اللہ درجتہ فی اعلیٰ علیین وجعل قبرہ روضۃ من ریاض الجنۃ کا وصال ایسے وقت ہوا جس وقت ان کا وجود عالم اسلام کے لئے پانی اور غذا سے زیادہ ضروری تھا ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں بہتر مقام عطا فرمائیں ۔ اور ہم گناہ گاروں پر ان کی برکات وفیوض نازل فرمائیں ۔ حضرت مولانا مرحوم کی خوبیاں اور کمالات تو وہ حضرات جانتے ہوں گے جو حضرت کے معاصر یا ہم پیالہ وہم نوالہ ہوں ۔ ہم جیسے نابکار تو ان کے کمالات اور محاسن کا ادراک بھی نہیں کر سکتے ۔ اور نہ ہی ہمارا شکستہ قلم حضرت کی علمی وعملی کاوشوں کا احاطہ کر سکتا ہے تاہم مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے تحت چند باتیں جو سطحی طور پر ذہن میں آئیں حوالہ قرطاس کر لیتا ہوں ۔

۱۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ درس وتدریس کے شہسوار ۔ علم حدیث کے مسند نشیں ۔ عمل کے راہی ۔ اخلاص وتقویٰ کے پیکر ۔ مجسم تواضع حسن صورت وحسن سیرت کا پتلا تھے ۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے باطنی حسن وجمال کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی خوب نوازا تھا ۔ ان کے چہرے میں بلا کی کشش تھی ۔ ان کے رخسار گلاب کے پھول کی طرح معتقدین ومتوسلین کو دعوت نظارہ دیتے تھے ۔ بڑھاپے اور ضعف ونقاہت کے باوجود ان کے چہرے کی شادابی جوانوں سے زیادہ تھی ۔ ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی یقین ہو جاتا تھا کہ یہ کسی اللہ والے کی صورت ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے میں بلا کی معصومیت رکھی تھی ۔ ان کے چہرۂ اقدس پر نگاہ پڑتے ہی اللہ تعالیٰ یاد آتے تھے ۔ ان کو رب ذو الجلال نے اذا راو ذکر اللہ کا مصداق بنایا تھا ۔ علم حدیث مولانا کا اوڑھنا بچھونا تھا ۔ وہ طلبا اور علماء کی محبت کی جولانگاہ تھے ان کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی ۔ وہ جہاں بیٹھتے وہاں علم کے خزانے کھلتے ۔ عمل کی ہوائیں چلتیں ۔ تقویٰ واخلاص کی خوشبو پھیلتی ۔ اور ان کی مجلس کی بہاریں مشام جان کو معطر کر لیتیں

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو او
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

ان کی محفل میں سیرت طیبہ سے لے کر آزادی ہند تک کی پروقار مستند معلومات ہوتیں۔ ان کے چشمہ صافی سے عوام و خواص سب بقدر ظرف شراب معرفت پی کر سیراب ہوتے۔ ان کے انداز بیان میں مقناطیس کا اثر تھا جب کسی مسئلہ پر لب کشائی فرماتے تو علم و حکمت کا اتھاہ سمندر موجزن ہوتا۔ وہ علم کا سمندر تھے جو ساحل سے بے نیاز ہو۔ وہ ایک گلستان تھے جس کی خوشبو دنیا کے چپے چپے میں بسی ہوئی تھی۔ وہ ایک شجر ثمر دار تھے جس کے پھلوں سے ایک عالم سیراب ہوا۔ وہ ایک گوشہ نشین تارک الدنیا تھے۔ جو دنیا و ما فیہا سے بے نیاز ہو کر علم دین کی خدمت میں مشغول ہوں وہ ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے ندانند جام و سندان باختن

کا صحیح مصداق تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق اور قدیم الزمان مدرس تھے۔ جن کی بالذات یا بالواسطہ شاگردی سے شاید ہی کوئی تہی دامن رہ چکا ہو۔ دنیا کے کونے کونے میں ان کے علم کی نہریں جاری ساری تھیں۔ یہ حضرت مولانا مرحوم کی خوش نصیبی ہے کہ پاکستان اور بیرون ملک کے دینی مدارس کے اکثر شیوخ الحدیث حضرت مولانا کے بالذات یا بالواسطہ شاگرد ہیں۔ اور حضرت مولانا کے لئے صدقہ جاریہ کا کام دیتے ہیں۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کی مسند درس کو بھی رونق بخشی اور نوعمری میں اپنے علم کا لوہا منوالیا۔ اور تھوڑے عرصہ میں استاد الحدیث کی مسند کو زینت بخشی۔ اور ہزاروں مہمانان رسول کو قال اللہ تعالیٰ و قال الرسول کی لذتوں سے آشنا کر دیا۔ اور دارالعلوم دیوبند ہی میں مولانا عبدالحق النافع کے پیارے لقب سے ملقب و موسوم ہوئے۔ اور ابھی شاید عمر کی ۴۰ بہاریں بھی نہیں گذری تھیں کہ سب کے منظور نظر اور اعلیٰ پائے کے اساتذہ کی صفوں میں شامل ہوئے اور چشم فلک نے یہ نظارہ دیکھ لیا۔ کہ ایک سرحدی عالم کے نازک لبوں نے علم حدیث کی کتابوں کو بوسہ دیا۔ اور اکابر و اصاغر سے داد تحسین وصول کی۔ اور ان بزرگوں کی دعاؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ جن کے دم قدم سے علم دین کی عمارت پاک و ہند کی سرزمین پر قائم تھی۔

اپنے اساتذہ سے سنا ہے کہ مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند میں ہر درجہ کے طالب علموں کو محبوب و منظور تھے سب ان پر جان نچھاور کرتے تھے۔ اور عقیدت کے پھول ان کے قدموں پر ڈالتے تھے۔

آج مولانا مرحوم کی وفات پر صرف پاکستان نہیں بلکہ ہندوستان، افغانستان، ایران اور اسلامی ممالک کا گھر گھر رو رہا ہے۔ اس قحط الرجال کے بدقسمت دور میں حضرت مولانا کی وفات قیامت سے کم نہیں

آج مولانا ایک عالم کو یتیم کر کے رخصت فرما گئے۔ اور اپنے متوسلین کو ورطۂ غم وحیرت میں چھوڑ دیا۔ آج مولانا علم حدیث، درس و تدریس کی مسند کو ویران چھوڑ کر جانب خلد بریں تشریف لے گئے۔ اور اپنے پیچھے ایسی مہیب خلا چھوڑی جس کے پُر ہونے کا بظاہر امکان نہیں۔ آج ان کو علم حدیث کے اوراق رو رہے ہیں مولانا کی وفات پر ہر گھر ماتم کناں ہے۔ ان کی وفات موت العالِم موت العالَم کا صحیح مصداق ہے۔

آج وہ تو مسکراتے ہوئے اپنے اعمال حسنہ اور صدقات جاریہ کا بیش قیمت خزانہ لے کر اللہ میاں کے ہاں پہنچ گئے۔ مگر اپنے پیچھے رونے والوں کا ایک لشکر عظیم چھوڑ گئے۔ شاید کسی ہاتف نے مولانا کے کانوں میں یہ مضمون پہنچایا تھا ؎

یاد داری کہ وقت آمدنت　　　ہمہ خنداں بوند و تو گریاں

ایں چناں زی کہ وقت مردن تو　　　ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

مولانا مرحوم میں رب کائنات نے اتنی خوبیاں جمع فرمائی تھیں کہ الفاظ و بیان کا دامن ان کے بیان سے تنگی کا شاکی ہے ؎

دامنِ نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار　　　گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

وہ ایک طرف کاروان علم کا سپہ سالار تھے۔ تو دوسری طرف تشنگان علم عمل اور دلدادگان تصوف کی پناہ گاہ تھے۔ طریقت و حقیقت کے عاشقوں کی سیرابی کا چشمۂ صافی اپنے سینہ میں سموئے ہوئے تھے علم ظاہری و باطنی دونوں میں اپنے شیخ حضرت مدنیؒ کے صحیح جانشین تھے۔ بلکہ حضرت مدنیؒ کے عاشق زار تھے۔ حضرت مدنی کے تذکرہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں کا سمندر بن جاتیں۔ شاید ان کی کوئی مجلس شیخ الاسلامؒ کے تذکرہ سے خالی ہو۔ اپنے شیخ سے ان کی محبت عشق و وارفتگی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ وہ حضرت مدنیؒ کے ظاہری و باطنی کمالات کے تہہ دل سے معترف تھے۔ ان کے علم و عمل کو حضرت مولانا نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور خلوتؓ جلوت میں انہی کے نقش قدم پر گامزن تھے۔ انہوں نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق خلق کے نسخۂ کیمیا پر عمل کرنا حضرت مدنی سے وراثت میں پایا تھا۔ مسند حدیث کی تزئین کے ساتھ قومی سیاست میں حصہ لینا حضرت مدنی ہی کی اتباع کا ثمرہ تھا۔ بادشاہی میں فقیری اور بلند مراتب کو چھونے کے باوصف تواضع حضرت مدنی کا وطیرہ تھا۔ جو حضرت مولانا میں اکمل طریقے سے موجود تھا۔ مخالفین کی ریشہ دوانیوں پر جام صبر نوش فرمانا بھی حضرت مدنی سے نسبت کا نتیجہ تھا۔ وہ حضرت مدنی کو صرف استاد و شیخ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ایک اتالیق و مربیّ اور روحانی والد سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان میں حضرت مدنی کے کمالات کا پر تو تھے۔ حضرت مدنی کے انفاس طیبہ سے حضرت مولانا کی شخصیت بنی۔ عشق نبویؐ کا چراغ حضرت مولانا کے قلب میں حضرت مدنی کی جلائی ہوئی شمع کے طفیل تھا۔

اور اس چراغ حقانی نے ایک دنیا کو منور کر دیا ؎

جو آگ کی خاصیت وہ عشق کی خاصیت

اک خانہ بخانہ ہے اک سینہ بسینہ

اور یہ حضرت مدنیؒ کی نظر کیمیا اثر کا نتیجہ ہے کہ حضرت مولاناؒ سے اللہ تعالیٰ نے دین کی خدمت لی جس کی نظیر اس آخری دور میں ناممکن نہ ہو تو مشکل ضرور ہے۔ حضرت مولانا مرحوم معقولات اور منقولات دونوں میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان کو حدیث کی طرح فنون کی کتابیں اور مسائل بھی ازبر تھے۔ بایں ہمہ وہ اپنے کمالات کو خوب چھپانے کی کوشش کرتے تھے اور اپنی کسی ادا سے اپنا علمی کمال ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

حضرت مولاناؒ نے اپنے زمانے کے باکمال اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ اپنے علاقہ کے جن بزرگ اور پختہ کار علمی ہستیوں سے انہوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ ان میں میرے نانا حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب نور اللہ مرقدہ عرف شاہ منصور لالا صاحب کی مغتنم ہستی شامل تھی۔ ہمارے گاؤں شاہ منصور کو دیگر سعادتوں کی طرح یہ سعادت بھی حاصل رہی کہ یہ حضرت شیخ الحدیثؒ کا مستقر اور علمی گہوارہ رہ چکا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں انہوں نے ہمارے گاؤں میں بار بار قدم رنجہ فرمایا۔ آپ شاہ منصور کی ایک مسجد میں تحصیل علم کے سلسلہ میں مقیم رہے۔ اور میں نے نانا صاحب مرحوم سے خود سنا کہ جب میں شاہ منصور سے کوہاٹ بغرض تدریس جا رہا تھا تو اس ہونہار طالب علم نے جس میں اپنے وقت کے شیخ و مقتدا بننے کا جوہر پنہاں تھا، کہا کہ میں آپ کی سرپرستی میں سفر علم طے کرنا چاہتا ہوں اور رخت سفر کوہاٹ باندھنا چاہتا ہوں۔ لیکن پہلے اپنے والد بزرگوار سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ اگر انہوں نے مشورہ دیا تو میں جہانگیرہ کے اسٹیشن پر آپ کا انتظار کروں گا۔

اس وقت حضرت مولانا نوعمر بے ریش و بے بروت تھے۔ نانا صاحب نے فرمایا جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو وقت کا یہ ولی شیخ الحدیثؒ اپنا مختصر سامان سفر لئے ہوئے سراپا انتظار تھا۔ پھر وہ میرے ساتھ کوہاٹ تالیموں کے مدرسہ میں تشریف لے گئے۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ شیخ الحدیث مرحوم نے شاہ منصور اور کوہاٹ میں نانا صاحب کے ساتھ کتنا عرصہ گذارا۔ تاہم اتنا معلوم ہے کہ یہ دونوں جگہیں حضرت شیخ الحدیث کے قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہوئیں۔ اور ان کے اقدام پاک کو کوہاٹ اور شاہ منصور کی سرزمین نے چوما۔ اس

چھوٹے سے واقعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ الحدیث مرحوم میں علم دین سے محبت کے باوصف والد ماجد کی تابعداری کا کتنا جذبہ موجزن تھا۔ نیز اساتذہ کرام سے کتنا گہرا تعلق اور کتنی سچی محبت اور عقیدت مرکوز تھی۔ سچ یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کی شخصیت کی نکھار میں اساتذہ سے تعلق کا بڑا دخل ہے۔ حضرت شیخ الحدیث گویا ان اشعار کے مضمون پر عمل پیرا تھے۔

رأیت احق الحق حق المعلّم
وا وجبہ حقاً علی کل مسلم

میں استاذ کا حق سب سے افضل بلکہ سب سے لازم اور ضروری ہر مسلمان پر سمجھتا ہوں۔

لقد حق ان یُھدی الیہ کرامۃ
لتعلیم حرف واحد الف درھم

وہ اس عزت و کرامت کا حقدار ہے کہ ایک حرف کی تعلیم کے عوض ان کی خدمت میں ہزار درہم ہدیہ کئے جائیں

علم کی اشاعت سے محبت دین کی خدمت خواہ دنیا کے کسی کونے میں ہو رہی ہو، حضرت شیخ الحدیث سن کر خوشی سے جھوم اٹھتے اور کیوں خوش نہ ہوتے ان کی زندگی کا محور ہی دین کی اشاعت تھا۔ انہوں نے قومی اسمبلی کے ایوان میں جانا ہی دین کی خاطر قبول فرمایا تھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی دین تھا۔ ان کا وظیفہ یہ تھا ؎

سھر العیون لغیر وجھک باطل
و بکاء ھن لغیر فقدک ضائع

آنکھوں کو تیری ذات کے علاوہ دوسرے مقصد کے لئے بیدار رکھنا باطل ہے۔ اور تیری تلاش کے بغیر رونا بے کار اور ضائع ہے۔

دین کی خاطر انہوں نے دن کا آرام اور راتوں کی میٹھی نیند قربان فرمائی تھی۔ دین کا درد ان کے دل میں ایسا پنہاں تھا جیسے مجنوں کے دل میں لیلیٰ کی یاد۔ ان کی زندگی کا مقصد وحید ہی دین کی سربلندی کی سعی تھی۔

عید الفطر ۱۴۰۸ھ کے کچھ دن بعد فقیر راقم الحروف اپنے نانا زاد بھائی مولانا لیکچرار اظہار الحق صاحب کے ساتھ قدمبوسی کا شرف حاصل کرنے کے لئے حاضر خدمت ہوا۔ حضرت کا چہرہ نقاہت اور ضعف کے باوجود گلاب کی طرح چمک رہا تھا۔ زبان میں وہی پرانی شستگی و روانی تھی۔ کمزوری اور ناتوانی الفاظ کے سیلاب اور علوم کی روانی کو نہیں روک سکتی۔ حضرت نے احوال پوچھے۔ میں نے کہا جنوبی افریقہ میں ایک مدرسہ میں مدرس ہوں۔ جس میں درس نظامی اردو زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ حضرت بہت خوش ہوئے اور اس دور دراز ملک میں جو نسلی امتیاز کی پالیسی میں گالی کی حد تک بدنام ہے۔ مدارس کا سلسلہ قائم ہونے پر نہایت خوشی ظاہر فرمائی۔ بہت دعائیں

دیں۔ ورا پنا دامن حضرت کی مشفقانہ دعاؤں سے لبریز کر کے واپس ہوئے۔ حضرت مولانا دعا کو اپنی زندگی کا اہم وظیفہ سمجھتے تھے۔ اور ہر وقت ہر مقصد میں دعا ہی کو کامیابی کا وسیلہ سمجھتے تھے ؎

حافظ وظیفہ تو دعا کردن است و بس در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

پر ان کا عمل نقاب اب ایسی ہستیاں کہاں ملیں گی؟ ایسی شخصیات کمیاب نہیں نایاب ہیں ؎

نہ قاصد، نہ صبائے نہ مرغ نامہ بری بسوئے یار رساند زنز د ماخبرے

اے باد گر بگلشن احباب بگذری زنہار عرض کن بر جاناں سلام ما

مولانا کی رحلت سے علماء و طلباء کا ظاہری سہارا ٹوٹ گیا اور دنیائے حدیث ایک کہنہ مشق اور ماہر استاذ سے محروم ہو گئی۔ اب کون حدیث کے چمنستان میں پھول کھلائے گا۔ کون مجاہدین کی صفوں کو اتحاد کی تلقین کرے گا؟ کون جہاد کے تن مردہ میں روح جہسوی پھونکے گا؟ سچ یہ ہے کہ مولانا اپنی گوناگون صفات کی وجہ سے اپنی ذات میں انجمن تھے۔ جو بیک وقت بے شمار کام انجام دیتے تھے۔ وہ پچاس سال دین کی خاموش و پرجوش خدمت کر کے تھکے ماندے مسافر کی مانند خواب راحت فرمانے کے لئے اپنی خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رحمت کے فرشتے صف آرا ہو کر ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ان کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوں گی۔ قبر کی زمین ان کی آمد کی وجہ سے جھومتی ہوگی۔ مبشر و بشیر ان کے یقین و اعتماد سے بھرے ہوئے کلمات سے مسکراتے ہوں گے۔ جنت کی خوشبوئیں ان کے دماغ میں پہنچتی ہوں گی۔ اور دنیا میں جھوٹے موٹے کپڑے پہننے والا اور دنیا کی لذتوں کو طلاق دینے والا جنت کے لباس اور لذتوں سے سرشار ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں مولانا ان اشعار کے تن کو حقیقت کا جامہ پہنانے والے تھے۔

ان للہ عبادا فطنا۔ طلّقوا الدنیا و خافوا الفتنا۔ نظروا فیھا فلما علموا انھا لیست لحیّ وطنا جعلوھا لجۃً واتخذوا صالح الاعمال فیھا سفنا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے بعض ذہین بندے ایسے ہیں جو فتنوں کے خوف سے دنیا کو طلاق دیتے ہیں جب وہ دنیا میں غور کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ تو کسی زندہ کا وطن نہیں بنتی تو دنیا کی موجوں میں نیک اعمال کو کشتیاں بنا کر دنیا کو پار کر لیتے ہیں۔

اب مدرسہ کی چٹائی پر بیٹھنے والا جنت کے قالینوں سے لطف اندوز ہوگا۔ روشنیاں ان کا چہرہ تکتی ہوں گی۔ اور دنیا میں معمولی مکان میں رہنے والا انسان جنت کے عالیشان مکان سے لذت اندوز ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کسے خبر کہ شیخ الاسلام حضرت مدنی کا جانشین صوبہ سرحد کا وقار، افغانوں کا فخر، ملت کا قیمتی سرمایہ ـــ

بزم مدنی کا روشن چراغ اپنے متوسلین کو تاریکی میں چھوڑ کر گل ہو جائے گا۔

حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، حضرت بنوریؒ، حضرت مفتی محمودؒ، حضرت مولانا غلام غوثؒ کے بعد امت مسلمہ کی نگاہیں حضرت شیخ الحدیث کی ذات پر لگی ہوئی تھیں اور انہی کو دینی اور ملی محاذوں پر میر کارواں بنائے ہوئے تھے۔ اور انہی کو دین وسیاست کا بے تاج بادشاہ سمجھتے تھے۔ انہی کے اشارہ ابرو پر جان قربان کرنے کے لئے تیار رہوتے تھے۔ اور مشکلات میں انہی کی راہ تکتے تھے۔ انہی کے خطبات سے اپنے لئے منزل کی راہ متعین کرتے تھے۔ انہی کے خلوص واستقامت پر اعتماد کئے ہوئے تھے۔ اور ان کا عمل اپنے لئے مشعل راہ سمجھتے تھے۔ اور ان کو دنیا کے دشمنوں کے خلاف تلوار بے نیام سمجھتے تھے۔ انہی کی تقریروں سے آنکھوں کی ٹھنڈک روح کی تپش، سینے کی حرارت، دل ودماغ کی غذا، اعضاء کی قوت، اور ہر طرح کی خیر وبرکت حاصل کرتے تھے آہ! موت کے بے رحم پنجے نے ہم سے وہ لعل بدخشاں چھین لیا۔ اب وہ شخصیت کہاں؟ جس میں بے شمار خوبیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ اب وہ ہستی کہاں ہے جو زخمی قلوب اور دکھی انسانیت کے لئے مرہم کا کام دے اب وہ وجود کہاں جو گہرے زخموں کی مرہم پٹی کرے۔ اب وہ باکمال انسان کہاں جو ہر طبقے کے لئے سامان تسلی ہو۔ اب وہ فرد کامل کہاں جو صوبہ سرحد کے پہاڑوں کے دامن میں دیوبندیت کا علم بلند کرے۔ اب وہ روشن ستارہ کہاں جو ہر سال ہزاروں تاریک دلوں کو منور کرے۔ وہ آفتاب نیم روز ایسے وقت میں غروب ہوا کہ امت کو اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت مولانا مرحوم نے دین کی سربلندی کے لئے ہر موقع پر سرتوڑ کوششیں کیں۔ جب سوشلزم اور کمیونزم کا فتنہ نرم ونازک محبوبہ کی پرفریب شکل میں ظاہر ہوگیا اور پاکستان خصوصاً صوبہ سرحد کے غیور مگر سادہ لوح افغانوں کو اس کی زلفوں کا گرویدہ بنانے کی کوششیں کی گئیں، بلکہ پاکستان روس کی جوع البقر کی زد میں آنے لگا تو حضرت مولانا مرحوم اس فتنہ کی سرکوبی کے لئے اٹھے اور ان کی نگرانی میں نکلنے والے رسالے "الحق" نے اس کے تعاقب وتردید میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب نیشنلزم کے نام پر پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی سعی کی گئی تو مولانا نے سربکف ہوکر اس فتنے کو موت کی نیند سلانے کی ٹھان لی جب ملک دشمنان صحابہ کی زد میں آگیا۔ تو مولانا نے اپنے علم کے تیروں سے ان کے سینوں کو چھلنی کر دیا۔ جب اندرون اسمبلی اسلام کے خلاف بعض ناعاقبت اندیشوں نے دریدہ دہنی کی۔ تو حضرت مولانا نے ان کو دنداں شکن جواب دے کر ان کے دانت کھٹے کردئے اور ان کے شبہات کے تار پود بکھیر دئے۔

یا تنگ نہ کر مجھ کو اے ناصح ناداں
یا چل کے دکھادے کمر ایسی دہن ایسا

جب ملک میں بعض خواتین شیاطین کے روپ میں ظاہر ہونے لگیں تو مولانا نے ان کو راہ راست پر لانے کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ جب ملک کی سالمیت کو کبھی خطرہ لاحق ہوا تو مولانا کی نیم شب کی آہوں، پرتضرع دعاؤں اور سرتوڑ کوششوں نے ملک کی حفاظت پر حرف نہیں آنے دیا۔ جب افغانستان کو مارکس اور لینن کی مجازی اولاد نے آتش سوزاں بنا دیا تو مولانا نے ان کی لگائی ہوئی آگ کو مجاہدین کے بہتے ہوئے خون سے ٹھنڈا کر دیا۔

لیس من اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

اللہ تعالیٰ کے لئے تمام مخلوق کو فرد واحد میں جمع کرنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

مؤثق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب کے بعد مولانا سیماب کی طرح بیقرار پریشان تھے اور اپنے شاگردوں سے جن کی اکثریت کا تعلق افغانستان سے تھا مشورے فرماتے رہتے تھے بسا اوقات یہ مشورے رات گئے تک جاری رہتے۔ تا ایں کہ اپنے تلامیذ کو جہاد کی بھٹی میں کودنے پر مکمل طور پر آمادہ کر لیا اور یوں حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا مستقر اکوڑہ خٹک جہاد کی تربیت گاہ اور ٹریننگ گاہ بن گیا۔ بلکہ شہیدان کے خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے کا وقت آپہنچا۔ پھر مجاہدین کے کمانڈر حضرت سے مشورہ اور دعا لینے کے لئے روزانہ یا دوسرے روز حاضر ہوا کرتے تھے اور یہ پیرانا شیر اپنے اسی سال کے تجربات سے ان کی سرگرمیوں کو نوازتے رہے۔ اور ان کے جہاد کے انجن میں پیٹرول کا کام انجام دیتے رہے۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ خاموش مگر پرجوش عالم دینی شاگردوں کی ایسی کھیپ تیار کرے گا جو آگ و خون کی ندیوں میں کودنے کو سعادت ابدی سمجھے گی۔ کسے معلوم تھا کہ اس مرد درویش کے منہ سے نکلنے والے کلمات جہاد کے بارود سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ کون جانتا تھا کہ یہ مرد باخدا بغیر وسائل کے مسائل حل کرانے میں یکتا ہوگا ہے

اے دل طریق رندی از محتسب بیاموز
مست است در حق او کس ایں گماں ندارد

جل مرتا ہے شعلوں میں مگر اف نہیں کرتا
پروانے کا انداز وفا غور طلب ہے

واقعی یہ دین و علم کا پروانہ برسوں دین کی محبت میں جلتا رہا مگر اف تک نہیں کی۔ مرحوم نے دین کے چراغ کو باطل کی ظالم ہواؤں سے بچانے میں زمانے کے ہر ستم کو خندہ پیشانی سے اور دن کو قال اللہ تعالیٰ و قال الرسول

اور رات کو آنکھوں اور نالوں سے اس چراغ کی روشنی قائم رکھی اور بزبان حال یہ فرماتے رہے ؎

کوئی رہے نہ رہے اک آہ اک آنسو
بصد خلوص و بصد امتیاز ساتھ رہے

مولانا فخر افغان تھے | میں تو بعض حلقوں سے معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ حضرت شیخ الحدیث مرحوم واقعۃً فخر افغان تھے۔ میرے نزدیک وہ فخر افغان نہیں جو افغان مجاہد قوم کو عدم تشدد کا سبق پڑھا کر چار دیواری کے اندر بٹھا دے۔ اور ظالموں اور کافروں کے ظلم وکفر کو برداشت کرنے اور اسلام کو تہہ و بالا کرنے کی تلقین کرتا رہے وہ فخر افغان نہیں جو لا مذہبوں کے سامنے سر جھکا کر ایک خدا کو بھول جائے وہ فخر افغان نہیں جو غیر اللہ کے سامنے جھولی پھیلا دے اور اپنی قوم کی بیٹیوں کو بر سر عام برہنہ ہونے کی خاموش تلقین کرے۔ وہ فخر افغان نہیں جو اسلام کے علاوہ دوسرے تمام مذاہب یہاں تک کہ ہندو مذہب کو حق سمجھے۔ بلکہ وہ فخر افغان ہے جو اپنی قوم کو صدیوں پرانا سبق یاد دلا دے۔ اور ان کے بجھے ہوئے کوئلہ میں جہاد کی روح پھونک دے۔ جو ایسے مجاہدوں کی جماعت تیار کرے جو سر بکف اور کفن بر دوش ہو کر دشمنان اسلام کے سینوں میں نشتر پیوست کرے۔ وہ فخر افغان ہے جو مردہ دلوں کو نئی زندگی بخش دے۔ اور ان میں نیا شعور اور ولولہ پیدا کر دے۔ وہ فخر افغان ہے جو اندرون اور بیرون ملک قابل فخر شاگردوں میں دینی غیرت کی چنگاریاں بھر دے اور ان کو کفر کی آنکھوں کے لئے برق خاطف بنا دے اور ان کے تنکوں کو دینی تعلیم کے سیل رواں میں بہا دے۔ وہ فخر افغان ہے جو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا فلسفہ اور علم حدیث، حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسمٰعیل شہید کا جذبہ جہاد زندہ کرے۔ فخر افغان وہ ہستی ہے جو دیوبندیت کے عناصر اربعہ، امام ابو حنیفہ کی فقہ، شاہ ولی اللہ کی فکر، شاہ اسمٰعیل شہید کا جذبۂ جہاد، حضرت مجدد الف ثانی کے طریقہ اصلاح کو ترتیب دے کر اس میں دیوبندی روح ڈال کر دار العلوم حقانیہ کی شکل میں افغان قوم کے سامنے کھڑا کر دے اور اس بہارستان سے لوگوں کو لذت اندوز ہونے کی بھرپور دعوت دے اور سب لوگ ان کی دعوت پر لبیک کہہ کر پروانہ وار گریں۔

سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو بے شمار خوبیوں سے مالا مال فرمایا تھا اور ان کے وجود کے عالم اصغر میں عالم اکبر کی خوبیاں ودیعت رکھی تھیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو ایسی ہستی کے قرب میں رہ کر اپنے دامنوں کو ہیروں سے بھر چکے ہیں۔ قابل رشک ہیں۔ وہ حضرات جنہوں نے اپنے اوقات کو حضرت کی زبان سے نکلے ہوئے جواہر ریزوں کے جمع کرنے اور سلک تحریر میں پرونے کے لئے وقف کیا۔ اور قابل دید ہیں وہ ہستیاں جن کی آنکھیں صبح و شام حضرت کے دیدار سے منور ہوتی رہیں اور لیل و نہار کی قید سے آزاد ہو کر ہر دم حاضر خدمت رہے۔ ہم تو

ہزاروں میل دور رہنے کی وجہ سے ان کی زیارت اور آخری ملاقات سے محروم رہے۔ بس صرف ان کی یاد کو چراغ راہ اور شمع محفل بناتے رہے اور یوں کہتے رہے ؎

آئی جب ان کی یاد تو آتی چلی گئی — ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

اور زبان حال سے یوں بھی گویا ہوئے۔

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم — بعد جانی نبود در سفر روحانی

وفات حسرت آیات | یوں تو ایک دن سب کو یہ دنیائے فانی چھوڑ کر اپنے وطن اصلی آخرت کی طرف جانا ہے۔ دنیا میں جو بھی آیا بقا و دوام کے لئے نہیں آیا بلکہ اس کارزار زندگی میں محنت و سعی کرنے اور آخرت بنانے کے لئے آیا۔ بقول ابونواس ؎

لہ ملک ینادی کل یوم — لدو للموت وابنوا للخراب
الا یا صاحب القصر المعلیٰ — ستدفن عن قریب فی التراب
قلیل عمرنا فی دار دنیا — ومرجعنا الی بیت التراب

یعنی روزانہ ایک فرشتہ آواز لگاتا ہے ——— سب کا انجام موت ہے اور عمارتیں بنایا کرو، ان کا انجام بھی ویران ہونا ہے۔ اے بڑے محل کے مالک عنقریب تجھ کو مٹی میں دفن کیا جائے گا۔ اس دنیا میں ہماری عمر تھوڑی ہے مٹی کے گھر کی طرف ہمارا رجوع ہو گا۔ کل نفس ذائقۃ الموت کی آیت کریمہ سب کو موت اور فنا کی دعوت دے رہی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے تحفظ کے لئے دنیا کے تمام اسباب کا انتظام کرے۔ خوشگوار آب و ہوا سے متمتع ہوتا رہے۔ ڈاکٹروں کی ٹیمیں شب و روز اس کی صحت کی نگرانی کرتی ہیں ہر آفت و مضرت سے بچنے کے لئے دن رات ایک کر کے دربانوں کی جماعتیں اس کی حویلی کے سامنے سر و قد کھڑی رہیں پھر بھی اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدہ کی آیت کریمہ کا حکم ان تمام تحفظات کے پردوں کو پھاڑ کر اپنی تاثیر دکھاتے گا ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے

مگر مولانا مرحوم جیسے لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں کہ اعمال صالحہ سے توشہ دان بھر کر اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ جاتے ہیں۔ اور لوگوں کو روتا ہوا چھوڑ کر خود خنداں و خراماں سوئے آخرت تشریف لے جاتے ہیں اور حافظ شیرازی کی زبان میں فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کز این منزل ویراں بروم — راحت جان طلبم و از پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — بر سر میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

حضرت مولانا ان لوگوں میں سے تھے جو حیات مستعار کے ایام کو اپنے جاناں کی نذر کرکے آخرت کو سدھارے اور اپنے اور پیرو دنیا کی راحتوں کو حرام کرکے دین کی خاطر کسی بھی مشقت جھیلنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ بلکہ مولانا جیسے حضرات کے لئے تو موت ایک تحفہ ہوتا ہے۔ ایسے خطرات کی روحیں موت کی پکار کو سن کر خوشی سے جھوم اٹھتی ہیں۔ وہ دنیا کو فانہ ویران سمجھتے ہیں۔ اور آخرت کی نعمتیں ان کو کشاں کشاں اپنی طرف بلاتی ہیں۔ حضرت علیؓ جنگ صفین میں معمولی کرتہ پہن کر دو صفوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔ ان کے صاحبزادہ حضرت حسنؓ نے فرمایا۔ اے میرے والد ماجد ما ھذا بزی المحاربین۔ یہ لڑنے والوں کی ہیئت اور لباس نہیں ہے۔

حضرت علیؓ فرمانے لگے لا یبالی ابوک علی الموت سقط ام سقط علیہ الموت۔ آپ کے والد کو یہ پروا نہیں کہ وہ موت پر گر جائے یا موت اس پر گر جائے۔

حضرت عمارؓ جنگ صفین میں شہادت کے مرتبے پر سرفراز ہونے سے قبل فرمانے لگے۔

غداً القی الاحبة محمداً وحزبه کل اپنے دوستوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت سے ملاقات ہوگی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایرانی سپہ سالار رستم بن فرخ زاد سے فرمایا تھا۔

فان معی قوماً یحبون الموت کما یحب الاعاجم الخمر یعنی جو قوم میرے ساتھ وابستہ قتال ہے وہ موت کو ایسی پسند کرتی ہے جس طرح عجمی لوگ شراب کو پسند کرتے ہیں۔

حضرت مولانا کا طریقہ تدریس جیسے پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ حضرت شیخ الحدیث حضرت مدنیؒ کا پرتو تھے۔ ان کا طریقہ تدریس بھی حضرت مدنیؒ ہی کی طرح تھا۔ الفاظ کی ادائیگی۔ مطالب کی تفصیل۔ زبان کی فصاحت۔ کلام کی دلنشینی۔ مضامین کی شیرینی۔ آواز کی بلندی اور صفائی۔ کلام کی برجستگی۔ مذاہب کی تفصیل۔ بیان کی دلاویزی میں وہ حضرت شیخ الاسلام کی تصویر اور عکس تھے۔ حضرت مدنیؒ کے کوثر و تسنیم میں دھلے ہوئے کلمات حضرت مولانا کے قلب پر نقش ہو گئے تھے۔ فقیر راقم الحروف نے حضرت شیخ الاسلام کی بخاری شریف کے درس کی کیسٹیں سنی ہیں۔ حضرت مولانا القیعؒ کو حضرت مدنیؒ سے بہت مشابہ پایا۔ اگر پشتو اور اردو کا فرق نہ ہوتا تو پہلی سماعت میں حضرت مولانا پر حضرت مدنیؒ کا گمان ہوتا۔ اپنے شیخ کی طرح گھنٹوں گھنٹوں حدیث نبوی کے درس دیتے ہوئے حدیث کی لذتیں لوٹتے تھے۔ تھکاوٹ ان کے ہاں نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اور مفردات کی تشریح سے لے کر حدیث کے نکات تک کے نغمے چھیڑتے اور چمن حدیث میں وہ پھول کھلاتے جن کی خوشبو ہوش اڑاتی سے صحن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز ہے وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے۔

دارالعلوم حقانیہ ۱۹۴۷ء کو برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک حصے کا نام انڈیا یا بھارت اور دوسرے کا نام پاکستان رکھا گیا۔ غلامی کی طویل تاریکی کے بعد ایک نیا اسلامی خطہ مسلمانوں کے حصے میں آیا۔ اتفاق سے مسلمانوں کے حصے میں وہ سرزمین آئی جو اسلامی مدارس سے تہی دامن تھی۔ بڑے بڑے مدارس سب انڈیا میں رہ گئے۔ جہاں سے مسلمان ہجرت کر کے اس نوزائیدہ ملک میں چلے آرہے تھے۔ تقسیم سے کچھ پہلے حضرت مولاناؒ بھی دارالعلوم دیوبند کے فراق کا صدمہ برداشت کر کے سرحد تشریف لائے جو پاکستان ہونے کے ساتھ مولانا کا وطن اصلی اور مستقر بھی تھا۔ یہیں پر مولانا نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہیں پر ان کی تربیت ہوئی تھی اور علوم و فنون کا زیادہ حصہ بھی یہیں پر پڑھا تھا۔ چنانچہ صوبہ سرحد میں اپنی بستی اکوڑہ خٹک میں قیام فرما کر مسلمانوں کی اس دینی ضرورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت مولانا جانتے تھے کہ اب مساجد میں رہائش اور ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بے ترتیب کتابوں کے پڑھنے کا زمانہ نہیں۔ اب ترتیب کا دور ہے اور زمانہ نئے تقاضوں کے ساتھ دین کی خدمت کا متقاضی ہے۔ اب وہ دور نہیں کہ ایک طالب علم معقولات میں عمر کا اکثر حصہ گذار کر پھر علم حدیث کے گلشن میں قدم رکھے گا۔ اب معقولات اور قدیم فلسفہ کے زیادہ رٹنے رٹانے کا دور نہیں۔ اب سلم العلوم اور قاضی مبارک کے دس دس حواشی مطالعہ کرنے کا دور نہیں۔

حضرت مولاناؒ تاڑ گئے تھے کہ اب ایسے فتنے نمودار ہونے والے ہیں۔ جن کا مقابلہ قدیم فلسفہ نہیں کر سکتا۔ اب ایسے فتنوں کو گھٹا ٹوپ اندھیرے روئے زمین کو ڈھانپنے والے ہیں۔ جن میں قرآن و حدیث اور علوم نقلیہ میں مہارت ہی روشنی کا کام دے سکتے ہیں۔ یہ تاریکی چراغ مصطفوی ہی سے کافور ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لئے بالغ النظر علماء پیدا کرنا چاہئیں۔ مولانا کے پیش نظر یہ بھی تھا۔ کہ یہ خطہ مدارس سے خالی ہے۔ کہیں یہ اولیاء کا خطہ خانۂ ویران را دیومی گیرد کا مصداق نہ بن جائے۔ کہیں پاکستان بن جانے کے بعد یہاں کے عوام و خواص جدید تہذیب کی رو میں نہ بہہ جائیں۔ اور تقویٰ و خشیت الٰہی کا طوق زریں اپنے گلوں سے نہ اتاریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ علماء اپنے سب بچوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نذر کر دیں اور اسلاف کی پونجی نابکاروں کے ہاتھوں نذر آتش ہو جائے۔

چنانچہ مولانا نے بے سروسامانی کے عالم میں توکلاً علی اللہ تعالیٰ دارالعلوم حقانیہ کے نام سے اسلامی یونیورسٹی کھولی جس کا سرمایہ اخلاص تھا۔ جس کی عمارت توکل تھا۔ جس کا نصب العین علوم اسلامیہ کے عَلَم کو بلند کرنا تھا جس کا نصاب قدیم و جدید کا حسین امتزاج تھا۔ جس کا مقصد وحید علوم نبویہ کی اشاعت تھا جس کا مشن ہر باطل کو زیر و زبر کرنا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ حضرت مولاناؒ اپنے اخلاص کی برکت سے کامیابی سے خوب ہمکنار ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے تھوڑے عرصے میں ان کے لگائے ہوئے باغ کو بار آور فرمایا جو پودا انہوں نے لگایا

تھا۔ وہ میوہ دار درخت بن گیا اور مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت فرعہا فی السماء کا منظر خلق خدا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یوں دارالعلوم حقانیہ قوم کے لئے رحمت ثابت ہوا۔ اور اس نے وہ متقی اور مخلص علما پیدا کئے جن پہ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں کا مصرع صادق آتا ہے۔ اس نے وہ اہل اللہ قوم کو دئے جن کے تقوٰی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس نے وہ پختہ اور تجربہ کار مدرسین ملت کے حوالے کئے جن کی پختگی میں دشمن بھی کلام نہیں کر سکتا۔ اس نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دین کی فضا قائم کی۔ دین کا اب کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں دارالعلوم کے تابناک ستارے نہ چمکتے ہوں اور اپنی کرنوں سے روحانی غذا نہ پہنچاتے ہوں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

مولانا کی اولاد امجاد | ہر مسلمان خصوصاً عالم دین کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ میری اولاد میری اور اللہ رب العزت کی مرضی اور خوشنودی کا مجموعہ بن جائے۔ جس شخص کی اولاد اس کی تمناؤں پر پانی پھیر دے۔ وہ ناکام و نامراد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو صالح اولاد سے نوازا۔ ان کی اولاد میں مولانا سمیع الحق صاحب اور مولانا انوار الحق صاحب عالم باعمل اور اعلیٰ پائے کے مدرس ہیں۔ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کو تو اللہ تعالیٰ نے علمی اور سیاسی میدان میں کام کرنے کے لئے منتخب فرمایا۔ اور ہر میدان میں حضرت مولانا کے مشن کو پورا کرنے کا اہل بنایا۔ مدرسہ ہو یا میدان تحریر، اسمبلی ہو یا تقریر کی جولانگاہ۔ درس و تدریس ہو یا تعلیم و تفہیم وہ ہر محاذ کو سر کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ اور اپنی صلاحیتوں کو اسلامی نظام کی ترویج میں خرچ کرنے سے کبھی دریغ نہیں کرتے وہ اسلام کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں۔ ان کی تقریر کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی اور تحریر آب زر سے تحریر کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ ان کے قلم کے تیغ سے اہل باطل تھراتے ہیں۔ ان کا باطل شکن قلم جب اسلام کی صداقت کے دلائل دیتا ہے تو باطل کانپتے ہوئے زیر زمین چھپ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے

الغرض مولانا سمیع الحق، الحق کے ایڈیٹر قابل رشک صحافی صاحب طرز ادیب۔ متعدد کتابوں کے مصنف — دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم و استاد الحدیث، مدبر سیاست دان، بلند پایہ مدرس، زمزمہ سنج متکلم اور جید خطیب ہیں۔

حضرت مولانا مرحوم کے دوسرے صاحبزادے حضرت مولانا انوار الحق صاحب بھی جید عالم و مدرس استاذ الحدیث نیک صالح باغیرت عالم اور دار العلوم حقانیہ کے نائب مہتمم ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولاناؒ کی نیک اولاد اور لگائے ہوئے شجرہ طوبیٰ کا سایہ مخلوق پر قائم رکھے۔

وھذا دعا للبریۃ شامل

خطبہ مسنونہ کے بعد!

(۱) رسوخ فی العلم | عزیز طلبہ! پہلی بات یہ ہے کہ علم میں پختگی حاصل کریں، جس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ماہر اساتذہ سے کتابیں پڑھیں، پھر خوب محنت کریں، اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ کتب کا بھی اہتمام کریں، اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اپنے اساتذہ سے رجوع کریں، اس طرح علم پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی علمی پختگی کے لیے اس پر عمل بھی ضروری ہے، عمل کرنے کے بعد مسئلہ نہیں بھولتا۔ مثلاً اگر کوئی پوچھے کہ التحیات میں اشارہ کیسے کریں؟ تو جس نے اشارہ سیکھا ہو پھر عملاً خود اشارہ کیا ہو وہ بتادے گا، لیکن جس نے خود زندگی بھر اشارہ نہیں کیا تو وہ کیسے بتائے گا کہ اشارہ کسے کہتے ہیں؟

(۲) علم پر عمل | جو کچھ سیکھیں اس پر عمل کریں اور حفظ و مطالعہ اور معلومات رٹ لینے کے بعد کمثل الحمار یحمل اسفارا (جیسے گدھا جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں) نہ بنیں۔ گدھا کتابوں کا بوجھ تو محسوس کرتا ہے لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

بہرحال عمل انتہائی ضروری ہے لیکن عمل سے خشک مزاج جھگڑالو مولوی بننا مراد نہیں، آج منکرین حدیث اور منکرین قرآن بھی زیادہ ہو رہے ہیں، بعض لادین حکومتیں ان کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں لیکن یہ لوگ ان کے کام بھی نہیں آتے۔ بہرحال عمل کا یہ طریقہ نہیں مثلاً قرآن مجید پر تم نے عمل کرنا ہے تو جو آیتیں منسوخ ہوں اُن پر عمل کا مطلب یہ ہے کہ یہ اعتقاد ہو کہ یہ حکم ایک زمانہ میں حق تھا اور اب منسوخ ہو چکا ہے۔

(۳) اخلاص وللّٰہیت | تعلیم و تعلم میں اخلاص وللّٰہیت نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر ترقی نصیب نہیں ہوتی۔ اگر اخلاص نہیں اور ترقی نظر آئے تو سمجھ لینا کہ یہ ترقی نہیں بلکہ استدراج ہے۔ لیکن اخلاص کیسے پیدا ہو؟ تو اس کے لیے ایک طرف تو صالحین کی مجالست ضروری ہے، دوسری طرف وہ ریاضات جو صوفیاء کرام کا معمول ہیں اُن کو اختیار کرنا ہوگا ـــــ یہاں پر یہ بات یاد رکھیں کہ تعلیم و تعلم پر اجرت لینا اخلاص وللّٰہیت

کے منافی نہیں کیونکہ صحابۂ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدین کے زمانے میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اور اس کے بغیر تو دینی تعلیم اور اشاعت کا کام ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔

(۴) اشاعت علم | علم کی اشاعت اور جہالت کے خاتمہ کے لیے خوب کوشش کریں، تدریس اور تقاریر کے ذریعے علم کو پھیلائیں، تصنیف و تالیف اور تبلیغ کے میدان میں کام کریں۔

(۵) دفاع حق | اسلام کی مدافعت ہر وقت کرتے رہو۔ اسلام پر ہر طرف سے حملے ہوتے رہتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے معتزلہ، قدریہ، خوارج وغیرہ پر جو رد کیے ہیں یہ سب دفاع اسلام کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اسلام کے نام پر بہت سے فرقے کام کرتے ہیں، مثلاً پرویزی، قادیانی اور حزب اللہ کے نام سے کچھ لوگ اسلام کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ بلکہ آج تو کافروں نے بھی اسلامی علوم کو بڑی محنت سے حاصل کیا ہے، حتیٰ کہ بعض مسلمان علماء بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے ان کے برپا کیے ہوئے فتنوں کا سدباب کرنا ضروری ہے۔ ان کے نظریات معلوم کریں اور پھر ان پر خوب تحقیق سے رد کریں۔

(۶) سیاست | سیاست میں اس وقت تک بالکل حصہ نہ لو جب تک طالبعلمی کے دور سے گذر رہے ہو، اس طرح تمہاری علمی استعداد ضائع ہو جائے گی اور اِدھر اُدھر پھرنا ہی مقدر ہو گا۔ پودا اگر ایک جگہ ہی رہے تو وہ پھلتا پھولتا ہے لیکن اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ کو دو تین بار منتقل کیا جائے تو وہ سوکھ جاتا ہے اس لیے استقلال اور توجہ سے علم حاصل کرو تاکہ پھلو پھولو اور ثمرآور درخت بن جاؤ۔ ہاں جب عالم بن جاؤ پھر سیاست میں ضرور حصہ لو کیونکہ سیاست نہ ہو تو جن بے دینوں کے ہاتھ میں حکومت ہے وہ رہا سہا اسلام بھی ختم کر دیں۔ یہ تو اسلامی سیاسی جماعتوں اور سیاسی علماء کی برکت ہے کہ وہ کچھ کام کرتے رہتے ہیں تاکہ یہ ظالم کچھ دبے رہیں اور خالص لادینی اور کافرانہ نظام مسلط نہ ہو سکے۔

(۷) تنظیم | علماء کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ منظم رہیں۔ تنظیم سے میرا مطلب یہ ہے کہ علاقہ کے علماء خواہ وہ دارالعلوم حقانیہ کے فاضل ہوں یا دوسرے مدارس کے ہوں متحد اور منظم ہوں، ان کا باقاعدہ صدر اور دوسرے عہدیدار ہوں، یہ تنظیم علماء کے حقوق کا تحفظ کرے۔ الحمدللہ ہمارے علماء کی ہر جگہ اکثریت ہے۔ دارالعلوم حقانیہ کے بانی و مہتمم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کام کی برکت ہے کہ ملک میں کثیر تعداد میں کامیاب مدرسے ہیں، دینی ادارے ہیں، جہادِ افغانستان میں فضلاء مصروفِ کار ہیں۔ سیاسی میدان میں تحریک نفاذِ شریعت چل رہی ہے۔ یہ علماء پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا خصوصی احسان ہے اور اس احسان سے چشم پوشی بڑی ناسپاسی ہو گی، اور اسی احسان کی بدولت ہم پر حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں اور اولاد و احفاد کا بھی حق بنتا ہے۔ ترمذی شریف میں آیا ہے کہ جو تیرا استاد ہے،

کی اولاد کا بھی تم پر حق ہے، ان کا احترام دراصل اپنے استاذ کا احترام ہے۔

بہرحال ان علماء کو منظم کرنا ضروری ہے تاکہ لوگوں پر علماء کا رعب اور وقار قائم رہے، وہ ڈرتے رہیں اور کسی ظالم کے ہاتھ سے کوئی عالم تنگ نہ ہو۔

(۸) **عوام پر شفقت** یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ عوام کے لیے تمہارے دل میں خیرخواہی اور شفقت کا جذبہ ہو جب عوام آپ کو عالم اور بڑا سمجھتے ہیں تو آپ بھی لازم ہے کہ عوام سے شفقت اور نرمی سے پیش آئیں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ اگر لوگوں میں کوئی گناہ موجود ہو تو اسے دور کرنے کے لیے اپنے سے بڑے کے ساتھ باپ کی طرح اور چھوٹے کے ساتھ بھائی کی طرح بات کرو۔ اسے باپ یا بھائی تصور کر کے تو انشاءاللہ اس پر اثر ہوگا، اور اگر تشدد اور سختی سے کام لو گے تو لوگ بدظن ہوں گے اور بات بے اثر ہوگی۔

(۹) **فکرِ معاش** زندگی کے لیے معاش بھی ضروری ہے۔ جس کی معاشی حالت بہتر ہے تو فبہا ورنہ ذریعۂ معاش ایسا ہو کہ ساتھ ساتھ دین کی خدمت بھی ہو سکے، جیسے دینی مدرسہ میں تدریس اور امامت و خطابت وغیرہ۔ اور اگر اور کوئی راہ نہ ہو اور مجبوراً تجارت یا سکول ٹیچری گلے پڑ گئی تب بھی ساتھ ساتھ تبلیغ دین اور اشاعت علم ہرگز نہ چھوڑنا عوام کی اصلاح کرتے رہو۔ پھر سیاست میں بھی کامیابی ہوگی، عوام سے رابطہ نہ ہوگا تو سیاست بھی نہیں چلے گی اور تبلیغِ دین کا کام بھی نہیں ہو سکے گا۔

(۱۰) **اساتذہ اور مدرسہ کا احترام** شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی وصیت تھی کہ اپنے اساتذہ اور مدرسہ کے لیے بدنامی کا سبب نہ بنو، ایسی بات اور ایسا کام ہرگز نہ کرنا جس سے مدرسہ یا آپ کے استاد بدنام ہوا ور لوگ کہیں کہ اس کے اساتذہ بھی ایسے ہی ہوں گے ۔۔۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس مقصد سے تعبیر کرتے ہوئے یوں ارشاد فرمایا کرتے "جو پگڑی تم نے ہمارے سر پر رکھی ہے اسے اتار کر نہ پھینکیں"، تو یہ بڑا نکتہ ہے کہ علم اور اہلِ علم کی بدنامی تمہارے ہاتھ سے نہ ہو۔

باری تعالیٰ سب کو عالم باعمل بنائے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کے لگائے ہوئے اس گلشن کو شاداب اور آباد رکھے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

پاکستان آرمی میں جونیئر کمیشنڈ خطیبوں کی خالی آسامیوں کو پُر کرنے کیلئے مطلوبہ قابلیت کے حامل حضرات سے درخواستیں مطلوب ہیں۔

مطلوبہ قابلیت:- (الف) افواج پاکستان کے لیے منظور شدہ کسی دینی مدرسہ سے درسِ نظامی میں فراغت کی سند۔

(ب) پاکستان کے کسی بورڈ سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ۔

(ج) روزمرہ امور کے متعلق عربی بول چال میں مہارت، قرأت اور حفظ اضافی قابلیت تصور کی جائے گی۔

عمر:- یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ۲۰ سال سے کم اور ۳۵ سال سے زائد نہ ہو۔

عہدہ اور تنخواہ:- ملازمت کے لیے منتخب امیدواروں کو نائب خطیب (نائب صوبیدار) کا عہدہ دیا جائے گا۔ فوجی وردی کی بجائے منظور شدہ شہری لباس، جو فوج کی طرف سے مفت مہیا کیا جائے گا۔ فوج کے جونیئر کمیشنڈ افسروں کی طرح اوپر والے رینک میں ترقی کی گنجائش ہو گی۔

الاؤنسز و دیگر مراعات:- وہ تمام الاؤنسز و مراعات جو فوج کے دیگر متقابل جے سی او صاحبان کو حاصل ہیں انہیں بھی حاصل ہوں گی۔ مثلاً ذات کے لیے مفت راشن، مفت رہائش (جہاں مہیا ہو ورنہ کوارٹر الاؤنس) اپنے اور بیوی بچوں کے لیے مفت طبی سہولت، سفری مراعات، پنشن گریجویٹی اور بیمہ کی مراعات وغیرہ وغیرہ۔

ملازمت کی جگہ:- پاکستان میں یا پاکستان سے باہر کسی جگہ۔

تربیت:- امیدواروں کو فوجی زندگی سے روشناس کرانے کی خاطر خاص تربیت بھی دی جائے گی۔

طریقِ انتخاب:- (الف) مختلف مقامات پر ابتدائی تحریری امتحان (ب) طبی معائنہ (ج) انٹرویو

درخواستیں مجوزہ فارم پر اصل اسناد کی تصدیق شدہ نقول کے ہمراہ شعبہ دینی تعلیمات آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ آئی جی ٹی اینڈ ای برانچ جنرل ہیڈکوارٹرز راولپنڈی ۲۳ جون ۱۹۸۹ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔

درخواستوں کے فارم مذکورہ شعبہ دینی تعلیمات سے مبلغ ایک روپیہ ۶۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ لگے ہوئے (۹" × ۴" سائز کا) جوابی لفافہ بھیجکر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ نیز مذکورہ بالا فارم فوجی بھرتی کے دفاتر سے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

فارم طلب کرتے وقت اپنی قابلیت اور سند الفراغ کے بارے میں پوری معلومات لکھیں۔

نوٹ: انٹرویو میں دو دفعہ ناکام ہونے والے امیدوار درخواست دینے کے اہل نہیں ہیں۔

پاکستان آرمی

PID (1)

sasa Ibd.

مولانا عبدالقیوم حقانی فاضل و مدرس دارالعلوم حقانیہ

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا نظریۂ انقلاب و سیاست

ذیل کا مقالہ مولانا عبدالقیوم حقانی نے شاہ ولی اللہ سوسائٹی کی دعوت پر مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں ۵ راپریل ۱۹۸۶ء کے اجلاس میں پڑھا جس میں اکابر علماء، مشائخ، علمی و دینی شخصیتوں، سکول و کالج کے اساتذہ، پروفیسر، صحافی اور دانشور حضرات نے شرکت کی۔ بعد میں میاں محمد اجمل قادری مدظلہ امیر انجمن خدام الدین، مولانا عبدالرشید انصاری مدیر ہفت روزہ خدام الدین، جناب شبیر احمد نفیس مدیر ماہنامہ حق چار یار، سید احمد حسین زید مدیر ہفت روزہ ترجمانِ اسلام، سلطان القلم مولانا سید انور حسین نفیس رقم خلیفہ اجل حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ، جناب پروفیسر ہمایوں صاحب اور جناب مرزا جانباز صاحب مصنف کاروانِ احرار نے اظہارِ خیال فرمایا اور مقالہ کو موجودہ حالات میں تمام افرادِ امت کے لیے فکر انگیز اور انقلاب آفریں قرار دیا ——— (ادارہ) ———

تدبیرِ منزل، نظمِ مملکت اور فلاحِ امت کے اجتماعی، قومی اور ملی امور کی ترتیب و تنظیم کو سیاست کہتے ہیں، سیدنا امام الائمۃ، سید الفقہاء، محدث کبیر، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی کے تین مختلف ادوار اور تدریجی مراحل تھے۔

۱- اعلیٰ اور جامع منصوبہ بندی کے ساتھ اندرونِ خانہ وضع قوانین، ان کے نفاذ و اجراء اور غلبہ و استحکام کے لئے ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک جو مثالی طور پر کامیاب ہوئی۔

۲- عباسیوں کے طافیہ ابومسلم خراسانی کے مظالم، سفاکیوں اور چیرہ دستیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے والوں سے زبردست تعاون اور صحیح اسلامی انقلاب کے لئے ایک بڑی جماعت، مضبوط سیاسی قوت، اتحادِ امت اور ایک وسیع اور مؤثر تحریک و تنظیم کی تجویز و مساعی اور بالآخر شاندار کامیابی۔

۳- امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیاست کا تیسرا مرحلہ۔ فقہ مدوّن اور اسلامی آئین کی تدوین کی تکمیل، اطراف و اکناف

ملک میں آپ کے تربیت یافتہ رجال کار کا انقلابی کردار، محمد بن عبداللہ نفس زکیہؒ اور ابراہیم نفس رضیہؒ کی برپا کردہ وسیع انقلابی تحریک میں شرکت، امام صاحب کا حکومت کے انتقامی حربوں کا ہدف بننے اور خلعت شہادت سے سرفراز ہونے کے باوجود اجتماعی، قومی اور ملی مفادات کی سطح پر ۱۲۰۰ سال تک فقہ حنفی کی آئینی بالادستی چار دانگ دبستان فقہ کی ترویج، اور امت کے لئے اسلامی نظام حکومت اور شرعی نظام سیاست کے واضح خد و خال اور بے غبار لائحہ عمل۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں سیاسی طور پر ظلم و بربریت اور تشدد و استبداد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے تھے یہ وہی زمانہ تھا جب صدیق اکبرؓ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بیت اللہ کی چوکھٹ پر خاک و خون میں تڑپا دیا گیا تھا۔ ابن زیاد اور حجاج بن یوسف کی تلوار غریبوں اور بے کسوں کے سر پر لٹک رہی تھی۔ کہ اچانک بنی امیہ کی مردہ لاشوں سے عمر بن عبدالعزیز کو اموی تخت کی وراثت ملی۔ یہ ابوحنیفہؒ کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آزادی ملت کیلئے پہلے منشور کا اعلان کیا کہ

لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق

اللہ کی نافرمانی میں کوئی ہماری اطاعت نہ کرے

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدت خلافت کے بعد چھ خلفائے بنی امیہ یکے بعد دیگرے آئے جنہوں نے نبوت کی راہوں کو چھوڑ کر عجمی سلاطین کا وطیرہ اختیار کر لیا تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان کے بے پناہ مظالم، ناگفتہ حالات اور تشدد و استبداد سے نہ تنہا ٹکرانے، اشخاص اور چہرے کے بدلنے کے بجائے پورے نظام میں انقلاب لانے کی منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ تدوین فقہ و قانون اور تحریک نفاذ اسلام کی خاموش مگر حکیمانہ سیاسی پالیسی وضع کی جس کے بعد میں دور رس انقلابی نتائج نکلے۔ اور وہ اسلامی سیاست کے اصول بن کر تاریخ کا سنہری باب بن گئے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب بنی امیہ کے طاغیہ حجاج اور عباسیوں کے طاغیہ ابومسلم کی طغیانیوں، سرکشیوں، بے رحمیوں کے خونی مناظر، کھلے ہوئے جیل خانوں کی آہ و بکا اور شور و ہنگامہ کے ہیبت ناک تصور سے اچھے اچھوں کے ارادے پست ہو جاتے تھے۔ شیر بیشۂ آزادی روباہ مزاجی پر مجبور کر دیئے گئے تھے بڑے بڑوں کے ایمان خریدے جا رہے تھے مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ حکومت ظالمہ سے مقاطعہ اور ترک موالات اور استغنا و بے نیازی کی روش اختیار کر کے گویا اصلاح و تدبیر کی حکیمانہ سیاست پر عمل پیرا تھے اور کثرت سے یہ دو شعر پڑھا کرتے تھے

عطاء ذی العرش خیر من عطائکم

وسیبه واسع یرجی و ینتظر

عرش والے کی داد تمہاری داد و دہش سے بہتر ہے اس کا ابر کرم فراخ ہے جس سے امیدیں وابستہ ہیں اور جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وانتم تکدرن ما تعطون منکم
واللّٰہ یعطی بلا من ولا کدر

تم لوگ حکومت والے جو کچھ دیتے ہو اس کو گدلا کر دیتے ہو اور حق تعالیٰ دیتے ہیں جس میں نہ احسان جتلانے کی اذیت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی کدورت اس میں ہوتی ہے۔

امام زین العابدین کے صاحبزادے حضرت زید کی شہادت، امام حسن کے پوتے محمد بن عبداللہ نفس زکیہؒ کی شہادت اور سلاطین و امراء جور کی طرف سے امت پر مظالم و مصائب کے پیش نظر امام ابو حنیفہؒ کا فطری ترحم و جذبہ ہمدردی انہیں ہر گھڑی بے چین رکھتا تھا وہ امت محمدیہ کو ظالم سلاطین کے فولادی پنجے اور غلامی کی زندگی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں آپ نے اہل حق مظلومین، علماء طلباء فضلاء ائمہ مجتہدین، دین کے خدام اور امت کے عام افراد سے ہمدردی و خیر خواہی اور نصرت و مدد کے لئے وسیع پیمانے پر تجارت کا کاروبار شروع فرمایا غرباء کو مضاربت پر مال دیتے تھے اور اس سے ان کی مدد کرتے تھے۔ علماء کو تحائف اور طلباء کو وظائف جاری فرماتے تھے بڑوں کی مدد اور حاجت مندوں کی ضرورت، بیواؤں کی سرپرستی اور مستحقین پر جود و سخا آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی قیام گاہ "مجلس البرکتہ" کے نام سے معروف ہو گئی تھی۔ عامۃ الناس کے فائدے اور عام معاشی سدھار کے لئے صحیح اسلامی بنکاری کا نظام قائم فرمایا تھا جس کی ایجاد و توضیح کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے۔

کوفہ کے مشہور ظالم گورنر ابن النصرانیہ خالد اور یوسف کے زمانہ میں (جن کے دور میں دن کو رات کہنا بھی جرم تھا اور دن کہنا بھی گناہ۔) خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ حضرت زید بن علی کی جب کوفہ تشریف آوری ہوئی اور بنی امیہ کے خلاف مقابلہ کے لئے علی الاعلان چار ہزار افراد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تو انہوں نے بھی سیاست و ریاست کے اصول و احکام پر مجتہدانہ اور فقیہانہ نظر رکھنے والی مسلم شخصیت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے سامنے اپنے قاصد کے ذریعہ صورت حال رکھ دی۔ چنانچہ حضرت امام صاحب نے بغیر کسی لیت و لعل، تردد اور پس و پیش کے غیرت و حمیت اسلامی کے پیش نظر علی الاعلان فتویٰ جہاد صادر فرمایا کہ:-

"حضرت زید کا اس وقت بنی امیہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بدر میں تشریف آوری کے مشابہ ہے"

اس دور میں محدثین کے ایک بڑے طبقے نے ظالم سلاطین کے مقابلہ میں خاموشی اختیار کرنے اور اپنی ذاتی ذمہ داریوں کی تکمیل میں اپنی استطاعت کی حد تک مشغول رہنے کو اسلامی سیاست قرار دے کر گوشۂ خمول میں زندگی گذارنے کو ترجیح دی۔ مگر امام اعظم ابو حنیفہؒ حالات کا اندازہ، عواقب، و انجام اور نتائج سے بے نیاز ہو کر محض سیاست برائے سیاست کی خاطر میدان میں کود پڑنے کو شرعی اور فقہی نقطۂ نگاہ اور تعلیمات کی رو سے غیر مفید اور بعض حالات میں مضر اور قابل

مواخذہ جرم قرار دیتے تھے منکر کو بدلنا ضروری قرار دیتے تھے۔ مگر جب منکر کے بدلنے سے کسی بدترین منکر کو راہ ملتی تھی تو اعتدال اور احتیاط کی راہ چلتے تھے۔ حضرت امام صاحب ایسی قربانی جس کا فائدہ ایک دو افراد کے درجہ شہادت تک محدود ہو اور ملت کے لئے نافع نہ ہو اور جس سے بعض حالات میں دوسرے لوگوں میں بھی آگے بڑھنے کی جرأت اور ہمت چھوٹ جاتی ہو کے مقابلہ میں صالح رفقاء کی نصرت، ایک مضبوط جماعت اور ناقابل تفریق سیاسی قوت کے بہم پہنچانے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ فرمایا کرتے :۔

اگر حکومت جابرہ اور ظالم سلاطین سے مقابلہ کرنے والوں کو صالح رفقاء میسر آجائیں اور ایک آدمی ان کی سرداری کرے اور یہ ایسا آدمی ہو جو اللہ کے دین میں قابل اعتماد ہو اور اپنے مسلک سے نہ پلٹے تب مسلمانوں کو اس اجتماعی فرض کی ادائیگی کے طور پر اس میدان میں ثابت القدم اور راسخ العزم ہوکر ظالم سلاطین کے جور وستم کے مقابلہ میں ایک سیسہ پلائی دیوار ہو جانا چاہیئے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا نظریہ تھا کہ جابر سلاطین کے مقابلہ میں انفرادی قربانی، شہادت و جاں سپاری کا جتنا بھی بلند ترین مقام ہو اس میں شک نہیں مگر ان کی نظر و بصیرت دقیق اور دور رس نتائج پر تھی وہ خود کو قتل کرا دینے کے بجائے امکانات سے حتی الوسع نفع اٹھانے کے قائل تھے۔ وہ اجتماعی اور ملی فائدہ اور ملت کے احیاء اور اصلاح و تدبیر سے امکانی منافع کے حصول کو ترجیح دیتے تھے۔

احقر اسے امام ابوحنیفہ کے سیاسی مسلک اور اجتماعی زندگی میں خالص فقہی و شرعی سیاسی پالیسی قرار دیتا ہے۔

احقر نے اپنی تالیف دفاع امام ابوحنیفہ ص ۲۴۳ میں امام ابوحنیفہؒ کے سیاسی عمل کے اجمالی خاکہ کی یوں تلخیص لکھی ہے۔

" خلاصہ یہ کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ چالیس سال کی عمر سے ستر سال کی عمر تک میدان سیاست میں اترے رہے اور جب تک دوسرے امکانات سے نفع اٹھانے کا موقع ملتا رہا۔ استفادے میں انہوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ سیاسی حکمت عملی، فقہ حنفیہ کی بالادستی، تلامذہ کے ایک بڑے حلقہ اور قاضیوں کی ایک بڑی جماعت کے مستقبل میں غلبہ اور فقہ حنفیہ کو آئینی حیثیت اور قانونی تحفظ اور عملاً مکمل نفاذ کی راہ ہموار کرنے کے بعد سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق کا اظہار کرکے جام شہادت نوش کیا۔

حکم بن ہشام کہا کرتے تھے کہ :۔

" ہماری حکومت (بنی امیہ) نے ہزار چاہا کہ اپنے خزانوں کی کنجیاں امام ابوحنیفہؒ کے حوالے کردیں یا وہ اپنی پیٹھ پر کوڑے پڑوانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ امام ابوحنیفہؒ نے حکمرانوں کے عذاب کو اختیار کرلیا مگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے جان چھڑالی۔

حکومتِ بنی امیہ کی امام ابوحنیفہؒ کے متعلق اول سے یہ پالیسی تھی کہ پہلے نرمی سے کام لیا جائے اور نرمی میں جس حد تک مبالغہ ممکن ہو اس میں کمی نہ کی جائے ۔ لیکن نرمی سے جب کام نہ چلے تب گرمی کے طریقوں کو اختیار کیا جائے ۔

چنانچہ روئے زمین کی سب سے بڑی قاہرہ حکومت کے سب سے بڑے گورنر ابن ہبیرہ نے امام صاحب کی خدمت میں حکومت بنوامیہ کی سیاسی پالیسی کی تکمیل کرتے ہوئے دوستی بڑھانے کی درخواست پیش کی ۔ اور کہا

حضرت شیخ ! اگر آپ اپنی آمد و رفت کو ہمارے ہاں ذرا بڑھادیں تو آپ سے ہم فائدہ اٹھائیں اور ہمیں آپ سے نفع پہنچے ۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنے استغنائی طرز عمل اور بے باکانہ گفتگو سے ابن ہبیرہ کی یہ پیشکش رد کرتے ہوئے فرمایا :۔

" تمہارے پاس آکر کیا کروں گا ۔ اگر تم مجھے نزدیکی اور قرب عطا کرو گے تو فتنہ میں مبتلا کرو گے ۔ اور اگر ہمیں تم نے دور رکھا یا قرب عطا کرنے کے بعد نکال دیا تو خواہ مخواہ کے غم میں مجھے مبتلا کرو گے "

عراق ، ایران اور خراسان جیسے عظیم صوبوں کے مطلق العنان حاکم (گورنر) ابن ہبیرہ نے اس کے بعد امام صاحب کو ایک بااختیار وزیر بنانے کی پیش کش کرتے ہوئے پیغام بھیجا کہ :۔

" گورنر کی مہر تمہارے سپرد کردی جائے گی ۔ تاکہ جو حکم نافذ ہو اور کوئی کاغذ جو حکومت کی طرف سے صادر ہو اور خزانہ سے کوئی مال برآمد ہو وہ سب آپ ہی کی نگرانی میں ہوگا ۔ اور آپ ہی کے ہاتھ سے نکلے گا "

مگر امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اپنی سیاسی پالیسی کی تکمیل اور حق کی بالادستی کی خاطر دولتِ بنی امیہ کے اس منصب جلیل کو ٹھکرا دیا ۔ تو گورنر ابن ہبیرہ نے آپ کو ۱۵ روز کے لئے جیل بھیج دیا ۔ زمانہ جس میں بھی طمع و لالچ اور جاہ و منصب کی مسلسل پیشکش ہوتی رہی اولاً شاہی کارخانہ کی نگرانی کا عہدہ پیش کیا گیا جب یہ نہ چلی تو عہدہ قضاء کی پیش کش کی گئی جب یہ پیش کش بھی ٹھکرادی گئی تو گورنر ابن ہبیرہ نے غیض و غضب سے معمور ہو کر قسم کھاتے ہوئے اعلان کیا کہ :۔

" اگر عہدۂ قضاء کو بھی امام ابوحنیفہؒ نے قبول نہ کیا تو میں ان کے سر پر کوڑے مارا کرتا رہوں گا "

دنیا لرز رہی تھی ۔ مگر امام ابوحنیفہؒ کی نظر کوڑوں سے زیادہ آخرت کے آہنی گرز کی چمک پر تھی ۔ چنانچہ اسی لب و لہجہ میں آپ نے بھی اعلان کر دیا کہ :۔

" خدا کی قسم ! میں ہرگز عہدۂ قضا قبول نہیں کروں گا مجھے ابن ہبیرہ قتل ہی کیوں نہ کر دے "

ابن ہبیرہ یہ جواب سن کر تلملا اٹھا ۔ ابوحنیفہؒ کو سپاہیوں کے ذریعے اپنے دربار میں حاضر کر کے موت کی دھمکیاں دینی شروع کر دیں تو ابوحنیفہؒ نے بڑی بے نیازی کے ساتھ فرمایا :۔

" صرف ایک ہی موت تک ابن ہبیرہ کا اقتدار ہے "

ابن ہبیرہ کے اشارہ سے امام صاحب کے کھلے سر پر جلادوں کے کوڑے برس رہے تھے۔ سر پر مار پڑنے سے چہرہ مبارک سوج گیا تھا۔ واپسی پر راستہ میں کسی تصور سے امام صاحب پر گریہ طاری ہوا۔ کسی نے وجہ دریافت کی تو ارشاد فرمایا۔
" اس مار کا مجھے خیال نہیں، بلکہ مجھے اپنی والدہ کا خیال آتا ہے میرے اس حال کو دیکھ کر اس بے چاری کا کیا حال ہوگا "

ہجرت کے ایک سو تیئیسویں سال جب بنی امیہ کی حکومت کے خلاف سارے ممالک اسلامیہ میں سازش کا جال پھیل گیا۔ امام ابوحنیفہؒ بھی بنی امیہ کے بے پناہ مظالم کے ستائے ہوئے تھے جہاد کے عنوان سے انتقام کے جذبات بھی ابھر سکتے تھے۔ مگر امام صاحب محض انقلاب اور محض شورش کے بجائے ٹھوس مثبت اور سودمند انقلاب لانا چاہتے تھے۔ چونکہ ابومسلم خراسانی کی قیادت میں برپا ہونے والی بغاوت میں ایسی کوئی توقع نہیں تھی اس لئے آپ نے ان دنوں مجاورت حرم کی زندگی اختیار کر لی۔ بلد الامین میں پناہ گزینی کی یہ مدت کوئی سوا چھ سال بنتی ہے۔

جب بنی امیہ کی حکومت ختم ہوئی اور عباسیوں کا پہلا خلیفہ ابوالعباس سفاح تخت نشین ہوا تب امام ابوحنیفہؒ حرمین الشریفین سے واپس تشریف لائے۔ سفاح چار ماہ حکومت کر کے فوت ہوگیا تو ابوجعفر منصور الدوانیقی سریر آرائے تخت ہوا جسے عباسیوں کے پہلے حقیقی خلیفہ دولت عباسیہ کے معمار اول اور اس کے حقیقی بانی ہونے کا مقام حاصل ہے۔ اسی ابوجعفر منصور کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کی کشمکش امام صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا سیاسی کارنامہ ہے۔

عباسیوں کے طاغیہ ابومسلم خراسانی جو اپنی سفاکانہ کرتوتوں میں ظالم الامۃ حجاج بن یوسف سے کسی طرح بھی کم نہیں مطلق العنانی اور اس شتر کینہ سیاہ سینہ فرماں روا کی ظالمانہ حقیقتیں بے نقاب ہو کر بہی خواہان ملت کے سامنے آئیں تو ابراہیم الصائغ جیسے صاحب اخلاص و دیانت کے دلوں کے اندر آگ کی طرح حق گوئی و بے باکی کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ چنانچہ اسی جذبہ انقلاب کے تحت وہ بغرض مشاورت و رہنمائی اور معاونت و ہمنوائی کے امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بڑے گہرے غور و فکر اور سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے ابراہیم الصائغ سے فرمایا کہ
" اگر اس کام کی سرانجامی میں کچھ صالح لوگوں کی جماعت مددگار بن جائے اور ان لوگوں کا سردھڑ بھی ایک ایسا آدمی ہو جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو "

اس ارشاد سے امام ابوحنیفہؒ یہ بتانا چاہتے تھے کہ بغیر کسی تنظیمی اور مضبوط سیاسی قوت کی فراہمی کے اس قسم کے خطرات میں چل پڑنے سے وضع قوانین اور ترویج شریعت کی حکیمانہ سیاسی پالیسی کا بنا بنایا پروگرام خاک میں مل جائے گا۔ ابوحنیفہؒ باضابطہ اور موثر اجتماعی تنظیم کے قیام تک انتظار کی گھڑیوں میں وضع قوانین اور رجال کار کی تربیت پر توجہ مرکوز رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی مقصد میں امام صاحب کامیاب ہوئے اور فیاض ازل نے انہیں ایسی دونوں صورتیں مہیا بھی کر دیں۔ ابراہیمؒ موت جیسے لاینحل عقدے کا حل چاہتے تھے اور وہ یہی تھا کہ خدا کے دشمن کی تلوار ان کو خدا کے پاس پہنچا دے اور وہ اپنے مالک حقیقی کے قدموں پر اپنی جان نثار کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت

ابراہیم کو شہید کر دیا گیا اور ان کی لاش کنوئیں میں پھینکوا دی گئی۔ رضی اللہ عنہ۔ مگر امام اعظم ابو حنیفہؒ نے افادے و استفادے اور نفع المسلمین کے پیش نظر باقاعدہ تنظیم و تحریک کے قیام کے انتظار کی ممکنہ ساعات میں حق کو آگے بڑھایا۔ باطل کو پیچھے دھکیلا۔ گو شہید ہوئے اور اسی منزل تک پہنچے جس تک حضرت ابراہیم الصائغ پہنچنا چاہتے تھے مگر انہوں نے اپنی قیمتی جان دے کر ذاتی منفعت خلعت شہادت کے علاوہ وضع قوانین، تدوین فقہ، اشاعت علم رجال کار کی فراہمی و تربیت، فقہی اصول، قواعد و کلیات، ہزاروں فروعات، اجتہاد اور استنباط مسائل اسلامی سیاست کے نشان راہ، اسلامی ریاست کا قیام اور اس کے نظام کے خدوخال یعنی فقہ حنفیہ کو ملک کی دستوری و آئینی حیثیت دلانا اور اس کے مکمل نفاذ کی صورت میں گرانقدر قیمت وصول کی۔ اسے ہم امام ابو حنیفہؒ کا سیاسی مسلک قرار دے رہے ہیں۔

اقامت حق اور ازالہ باطل کے لئے آپ کی اس خاموش اور حکیمانہ منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس فقہ حنفی ہی نہیں بلکہ فقہ حنبلی، فقہ مالکی اور فقہ شافعی کا عظیم قانونی ذخیرہ موجود ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ چاروں دبستان فقہ کی ترویج و اشاعت میں کسی نہ کسی حیثیت سے امام ابو حنیفہؒ ہی کی دیدہ ریزیوں کو دخل حاصل ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اپنا سیاسی نصب العین یہ متعین کر چکے تھے کہ اپنی پوری زندگی اور زندگی کے سارے وسائل کو کھپا کر جو صحیح چیز وہ تیار کر رہے ہیں۔ اس کے قبول کرنے پر حکومت کو مجبور کر دیا جائے۔ چنانچہ تیر نشانے پر بیٹھا۔ موفق نے لکھا ہے کہ:۔

"بالآخر امام ابو حنیفہؒ کی بات نے استواری حاصل کی اور امراء و سلاطین امام ابو حنیفہؒ کے محتاج ہو گئے۔ اور خلفاء کے درباروں میں ان کی اہمیت و ضرورت کا ذکر ہونے لگا"

یحیٰی بن آدم کہتے ہیں کہ خلفاء اور ائمہ یعنی مسلمانوں کے سیاسی حکمرانوں کا طبقہ اور حکام امام ابو حنیفہؒ کے مدونہ قوانین سے فیصلہ کرنے لگے اور بالآخر اسی پر سلسلہ ختم ہوا۔

ابو جعفر منصور نے مختلف حیلوں بہانوں سے ابو حنیفہؒ کے حکومت سے اشتراک عمل کی تحریک شروع کر دی۔ اس دوران یوں بھی ہوا کہ دنیا اپنی پوری رعنائیوں اور کشاکشوں کے ساتھ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے پاؤں پڑی۔ ابو جعفر منصور نے مختلف صورتوں میں عطایا، ہدایا، تحائف پیش کئے۔ وہ ابو حنیفہؒ کو اپنے کام کا بنانا چاہتے تھے۔ قدرت نے امام ابو حنیفہؒ کو شہید بنانا تھا اور صیاد بھی۔ مگر امام ابو حنیفہؒ صیاد ہی رہنا چاہتے تھے۔ بایں ہمہ حق گوئی و بے باکی اور اصلاح و تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ بھرے دربار میں علی الاعلان منصور سے اپنی ایک طویل جوابی تقریر میں کہا:۔

"کسی بھی حیثیت سے تمہاری حکومت شرعی اور آئینی نہیں ہے۔ جب تم نے حکومت سنبھالی تو اس وقت ارباب فتویٰ میں دو آدمی بھی تمہاری خلافت پر متفق نہیں تھے۔"

ابوجعفر اس تقریر سے سٹ پٹایا۔ مگر ہوشیار، مصلحت اندیش اور بڑا سیاس تھا۔ زہر کے بجائے گڑ کھلانے کے تجربے کو ترجیح دیتا تھا۔ کہ ادہر محمد بن عبداللہ نفس زکیہ نے مدینہ میں حکومت کے خلاف بغاوت اور مقابلے کا اعلان کر دیا تھا۔ بغاوت کی یہ تحریک ایک وسیع ہمہ گیر اور انقلابی تحریک تھی۔ ادہر عہد انتظار میں ابوحنیفہ نے تدوین فقہ و تربیت رجال کا کام مکمل کر لیا تھا۔ چنانچہ امام صاحب علی الاعلان کوفہ میں ابراہیم نفس رضیہؒ اور محمد بن عبداللہ نفس زکیہ کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ اور علی رؤس الاشہاد فتویٰ جاری فرمایا کہ " اس جنگ میں شرکت ۵۰ حج سے زیادہ افضل ثواب ہے۔ جس کے پیش نظر امام صاحب کے ہر شاگرد، مجلس وضع قوانین کے ارکان اور حلقہ درس کے تمام تلامذہ آپ کے اہل وعیال غرض سب کی زندگی خطرے میں آگئی — ایسے حالات میں امام ابوحنیفہؒ صالح انقلاب کے لئے ہر ممکن تدبیریں سوچ رہے تھے۔ اسی زمانہ میں امام ابوحنیفہؒ نے عباسی فوجی بساط کے سب سے بڑے مہرے اور زبردست موروثی نمک خوار اور وفادار جرنیل حسن بن قحطبہ کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ امام صاحب کی اس سیاسی تدبیر سے ابوجعفر منصور باوجود سیاسی مدبر، دلیر اور بہادر ہونے کے بوکھلایا۔ ایسے حالات اور حکومتی تحقیقات کے باوجود حکومت ابوحنیفہؒ پر ہاتھ ڈالنا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ دینے کے مترادف سمجھ رہی تھی۔

بہرحال تدبیر پر تقدیر غالب آگئی اور تحریک کچل دی گئی۔ نفس زکیہ اور نفس رضیہ دونوں بھائی شہید کر دئے گئے۔ ادہر خلیفہ منصور نے چن چن کر حیلے بہانوں سے بغاوت کی تحریک میں حصہ لینے والوں سے انتقام لینا شروع کر دیا۔ امام دارالہجرہ امام مالکؒ نے محمد نفس زکیہؒ کے خروج کے وقت فتویٰ دیا تھا کہ ابوجعفر منصور نے بیعت جبراً اور زبردستی لی ہے اس لئے طلاق واقع نہ ہوگی۔ اس جرم کی پاداش میں امام مالک کو ۳۰، اور بعض روایات کے مطابق سو کوڑے لگائے گئے بری طرح پٹوائے گئے۔ مونڈھے اتروا دئے گئے۔ ناقابل برداشت سزا سے امام مالکؒ بے ہوش ہو جایا کرتے تھے — ادہر امام ابوحنیفہؒ کی عظمت، رعیت میں اس کا مقام واہمیت اور کسی وقت بھی اقتدار کے لئے خطرہ بن سکنے کے خطرہ کو ٹالنے کے لئے منصور کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ چنانچہ منصور نے ۱۴۸ سے ۱۵۰ تک جو تعمیر بغداد کی تکمیل اور امام صاحب کی وفات کا سن ہے۔ تقریباً دو ڈھائی سال کے عرصہ میں منصور نے پھر سے امام صاحب سے نیا تعلق قائم کیا۔ چنانچہ امام صاحب کو کوفہ سے بغداد بلا کر اولاً قضا کا عہدہ پیش کیا۔ جب انکار دیکھا تو چند صوبوں کی قضا پیش کی۔ جب یہ بھی نہ چلی، تو آخر میں تمام ممالک محروسہ کے لئے ابوجعفر منصور قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرنے کی سماجت کرتے رہے کہ پورے ملک میں قاضیوں کے نصب وعزل کے اختیارات بھی امام صاحب کے پاس رہیں۔ مگر امام صاحب نے منصور پر تعریضاً وتنبیہاً یہ واضح کر دیا کہ تمہارے حوالی موالی، اعزہ واقربا اور نوکر شاہی کے افراد، انصاف، قانون کی بالادستی اور مساوات کے تقاضوں کو پورے کرنے میں بری طرح حائل رہیں گے۔ ارشاد فرمایا۔

" امیر المومنین! آپ کے گرد وپیش میں جو لوگ ہیں ان کو تو ضرورت ایسے حکام کی ہے جو آپ کی وجہ سے ان کا اکرام کریں"

آپ نے اسی مجلس میں خود خلیفہ پر بھی یہ واضح کر دیا کہ :-

" اگر کوئی مقدمہ آپ پر دائر ہوا اور آپ مجھ سے یہ چاہیں کہ قانون کے مطابق نہ کروں اور دھمکی دیں کہ اگر ا سے نہ کروگے تو تجھے دریا میں غرق کر دوں گا تو یاد رکھئے میں دریا میں ڈوب جانے کو پسند کروں گا۔ لیکن خلاف انصاف فیصلہ کروں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔

ایک مرتبہ ابوجعفر منصور نے حضرت امام اعظم کے پاس کچھ رقم بھیجی مگر آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ دوستوں اور خیرخواہوں نے مشورہ دیا کہ لے کر صدقہ کر دیجئے تو امام صاحب بڑی حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

اعندھم شیئ حلال ، او عندھم شیئ حلال — کیا ان لوگوں کے پاس حلال کچھ ہے کیا ان لوگوں کے پاس کچھ حلال مال بھی ہے۔

جب بعد الوفات امام ابوحنیفہؒ کو عام قبرستان کے بجائے علیحدہ دفن کیا گیا اور خلیفہ منصور قبر پر نماز پڑھنے آیا تو پوچھا کہ امام صاحب کو عام مقبرے سے علیحدہ کیوں دفن کیا گیا تو لوگوں نے جواب دیا۔ کہ امام صاحب بغداد کے خطۂ اراضی کو ارض مغصوبہ قرار دیتے تھے۔ یہ ان کا فتوٰی اور وصیت تھی کہ مجھے ایسی زمین میں نہ گاڑنا جو ناجائز ذریعہ سے حاصل کی گئی ہو۔ منصور نے جب یہ سنا تو امام صاحب کی قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

من یعذرنی منک حیاً و میتا — زندگی اور مرنے کے بعد بھی تجھ سے مجھے کون بچا سکتا ہے۔

بہر حال بات تو یہ چل رہی تھی کہ خلیفہ منصور نے امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی القضاۃ کے عہدے کی طرف سب سے پہلے ہارون الرشید کا ذہن منتقل ہوا۔ اور اس نے قاضی ابو یوسف کا اس عہدے پر تقرر کیا مگر واقعہ یہ ہے کہ سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ ہی نے اس کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ اور ابوجعفر منصور امام ابوحنیفہؒ کی حکیمانہ سیاست سے مجبور ہو کر انہیں اس عہدہ کی پیش کش کر رہا تھا۔ بعد میں امام ابو یوسف کا قاضی القضاۃ بننا یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا۔ بلکہ یہ امام ابوحنیفہ ہی کی سیاسی حکمت، منصوبہ بندی اور بہترین لائحہ عمل تھا۔ قاضی ابو یوسف امام ابوحنیفہؒ کی اس دور اندیشی کو یاد کر کے کبھی کبھی کہا اٹھتے

" امام ابوحنیفہؒ کتنے بابرکت انسان تھے کہ دنیا و آخرت کی دونوں راہیں ہم پر الٰہی کی کھولی ہوئی ہیں "

امام اعظم ابوحنیفہؒ خلیفہ منصور کی اس عظیم پیشکش (یعنی عہدۂ قاضی القضاۃ یا وزارت عدل کے منصب جلیل) کو بھی اپنی بصیرت اور دور اندیشی کے پیش نظر اپنے لئے زندگی کا اہم امتحان قرار دے رہے تھے۔ امام صاحب سمجھ رہے تھے کہ اس طریقہ سے ابوجعفر منصور مجھے اپنے قابو میں لانا چاہتا ہے۔ منصور طے کر چکا تھا کہ اس خطرناک کانٹے کو اپنی حکومت کی راہ سے بہر حال نکال باہر کروں گا اور اس کے دو ہی راستے ہو سکتے تھے یا تو انہیں حکومت میں شریک کر لیا جائے یا انہیں ختم کر دیا جائے۔ امام ابوحنیفہ کے سامنے بھی دو ہی راستے تھے۔

۱۔ یا تو منصور کے پیش کئے ہوئے اس آخری لقمہ کو نگل کر خود بچ جائیں لیکن اپنی زندگی کی ساری کمائی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔

۲۔ یا ابوجعفر کی بدگمانیوں کو یقین کے درجہ تک پہنچا کر اپنے مشن اور نصب العین کو بقا و دوام بخشنے کے لئے خود اپنی ذات کے ختم ہو جانے کے خطرے کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے دوسری صورت میں فقہ حنفیہ کے شاندار مستقبل کے پیش نظر اسی کو ترجیح دی۔ اور کوفہ کی جامع مسجد میں اپنے ایک ہزار تلامذہ کے عظیم مجمع کو خصوصی ہدایات دیتے ہوئے ایک تاریخی تقریر فرمائی جس کے چند ایک اقتباسات درج ذیل ہیں:۔ ارشاد فرمایا!

عزیز تلامذہ! میرے دل کی مسرتوں کا سارا سرمایہ تم لوگوں کا وجود ہے۔ تمہاری ہستیوں میں میرے حزن اور غم کے ازالہ کی ضمانت پوشیدہ ہے میں نے ایسا حال پیدا کر دیا ہے کہ لوگ تمہارے نقش پا کی جستجو کریں گے اور اسی پر چلیں گے۔ تمہارے ایک ایک لفظ کو اب لوگ تلاش کریں گے۔ میں نے بڑی بڑی گردنوں کو تمہارے لئے جھکا دیا اور رہموار کر دیا ہے۔

پھر ان چالیس تلامذہ کو خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتے ہوئے قریب بلایا اور ارشاد فرمایا۔

پس وقت آ گیا ہے کہ آپ لوگ میری مدد کریں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم چالیس میں ہر ایک عہدۂ قضا کی ذمہ داریاں کو سنبھالنے کی پوری صلاحیت اپنے اندر پیدا کر چکا ہے اور دس آدمی تو تم میں ایسے ہیں جو صرف قاضی ہی نہیں بلکہ قاضیوں کی تربیت و تہذیب کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں — میری یہ تمنا ہے کہ علم کو محکوم ہونے سے بچاتے رہنا۔ قضا کا عہدہ اس وقت تک درست اور صحیح رہتا ہے جب تک کہ قاضی کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ اسی قضا کی تنخواہ حلال ہے۔ مسلمانوں کا بادشاہ یا امیر اگر مخلوق خدا کے ساتھ کسی غلط رویے کو اختیار کرے تو اس بادشاہ سے قریب ترین قاضی کا فرض ہوگا کہ اس سے بازپرس کرے۔

ابوجعفر منصور کو ابوحنیفہ کی ایک ہزار تلامذہ سے یہ خصوصی میٹنگ ناگوار گذری اور انہیں کوفہ سے بغداد لا کر اولاً وزارت عدل کے منصب جلیل کی پیش کش کی۔ امام ابوحنیفہؒ پیہم معذرت کرتے رہے جب کوئی عذر قبول نہ ہوا تو امام صاحب نے کہا۔

انی لا اصلح یعنی قضا کی مجھ میں صلاحیت نہیں ہے۔

ابوجعفر نے کہا۔ بل انت تصلح بلکہ تم ضرور قضا کی صلاحیت رکھتے ہو۔

دونوں میں اسی سوال و جواب کا رد و بدل ہوتا رہا۔ ابوجعفر غضب ناک ہوا اپنے قطعی غیر مشکوک معلومات اور ذاتی تجربات پر اعتماد کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ سے کہنے لگا۔

کذبت انت تصلح تم جھوٹ بولتے ہو واقعۃً تم قضا کی صلاحیت رکھتے ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ بھی خاموش نہ رہ سکے بڑی استغناء اور بے پروائی کے ساتھ خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔
"لیجیے آپ نے اپنے خلاف خود فیصلہ کر دیا کیا آپ کے لئے یہ جائز ہے کہ اس شخص کو قاضی بنائیں جو آپ کے نزدیک جھوٹا اور کاذب ہے"

امام صاحب کے جواز سے عباسیوں کا مطلق العنان فرماں روا ذہنی شکست کی رسوائی کے پیش نظر زیادہ مشتعل ہو گیا۔ خطیب نے لکھا ہے کہ قسم کھا بیٹھا اور کہا کہ ابوحنیفہ کو بہر صورت یہ کام کرنا پڑے گا۔ مگر حضرت امام نے بھی اسی بے باکی و آزادی کے ساتھ قسم کھائی کہ
"خدا کی قسم میں ہرگز یہ کام نہیں کروں گا"

قرائن اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر منصور نے غصہ سے اندھا ہو کر عواقب و انجام اور نتائج کا اندازہ کئے بغیر ابوحنیفہ کو تیس کوڑوں کی سزا دی۔ جس سے ابوحنیفہ کی پشت پر نشان ابھر آئے اور ایڑیوں پر خون بہنے لگا صرف یہ نہیں بلکہ ابوحنیفہ کو جیل بھیج دیا ان پر سختی کرنے اور خوب ستانے کی تاکید کر دی۔ کھانے پینے میں۔ قید و بند میں، ملاقات میں سختی کی جانے لگی حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔

امام صاحب کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ زندگی بھی ساری علمی زندگی تھی۔ ادھر منصور نے بھی ایک دو نہیں تیس تیس کوڑوں کی مار دلوائی تھی۔ جیل خانے میں کھانے پینے کی تکالیف اور قید و بند کی سختیاں اور صعوبتیں اس پر مستزاد۔ صحت گر گئی۔ ابوجعفر منصور کے دار و گیر اور جبر و تشدد نے بوڑھی ہڈیوں میں آخر کیا چھوڑا تھا جو زندگی کا ساتھ دیتا۔ موت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور موت ہی کو قدرت نے امام ابوحنیفہؒ کی نجات کا ذریعہ بنا دیا۔ امام اعظم ابوحنیفہ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اپنی جبین نیاز بارگاہ صمدیت میں جھکا دی سجدے میں چلے گئے اور اسی حال میں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی ٥

تیری معراج کہ تو لوح قلم تک پہنچا میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

یہ ہجرت کا ایک سو پچاسواں سال تھا۔ شعبان، شوال یا رجب کا مہینہ تھا ابتداء میں اس خبر کو خواص تک محدود رکھا گیا۔ امام صاحب کے صاحبزادے حضرت حماد بغداد پہنچ چکے تھے۔ شہر کے قاضی حسن بن عمارہ نے جب آپ کو غسل دینے کے لئے کپڑے اتارے تو جسم پر کوڑوں اور مجاہدات کے ابھرے ہوئے نشانات دیکھ کر سب رو پڑے۔ خود قاضی عمارہ نہلاتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ شہر میں کسی قسم کی منادی یا اطلاع نہیں کی گئی سب کچھ مخفی رکھا گیا۔ جنازہ اٹھانے والے چار پانچ آدمی تھے۔ مگر جب خراسانی طاقوں سے گذر ہوا تو ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے شہر میں بجلی دوڑا دی۔ پل کے پاس دروازے کے پاس پہنچتے پہنچتے لوگوں کا اژدھام اور سیلاب تھا جو امڈ آیا ابو رجا ہروی کہتے ہیں۔

لم ار باکیا من یومئذٍ اتنے آدمیوں کو روتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اسباب وعلل کی روشنی میں انسانی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بخوبی معلوم ہوجاتا ہے کہ بعد کو جو حالات پیش آئے کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اقوال پر عدالتوں میں عمل ہونے لگا اور جب مامون نے اپنے چہیتے وزیر فضل ذوالریاستین کے کہنے پر ارباب علم ودانش اور اپنے خواص کی خصوصی مجلس مشاورت اس لئے بلائی کہ حنفی فقہ کو عدالت سے باہر کر دیا جائے تو بحث ومباحثے کے بعد ارباب مشاورت نے اس بات پر متفقہ فیصلہ دیا کہ

"یہ بات نہیں چلے گی بلکہ سارا ملک آپ لوگوں (عباسیوں) پر ٹوٹ پڑے گا اور حکومت کا نظام درہم برہم کر دیا جائے گا"

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی وفات کے کل بیس سال بعد ہارون الرشید کے خلیفہ ہونے تک بغداد، بصرہ، کوفہ، واسط، مدائن، مدینہ منورہ، مصر، خوارزم، کرمان، نیشاپور، سجستان، دمشق، ترمذ، جرجان، بلخ، ہمدان، صنعاء، شیراز، اہواز، تستر، اصفہان، سمرقند، ہرات اور ممالک محروسہ، عباسیہ کے تقریباً اکثر مرکزی مقامات میں حنفی، قاضی محکمۂ عدالت پر قابض اور دخیل ہو گئے۔ جن میں بعض کا تقرر منصور نے بعض کا مہدی نے اور بعض کا ہادی نے کیا تھا۔ اور ہارون کے عہد تک امام ابوحنیفہ کی انقلابی سیاست کے دور رس نتائج وثمرات کے ترتب کی تو انتہا ہو گئی۔ حنفی قضاۃ اور حنفیت کے سامنے عباسیوں کی جبار حکومت سر جھکانے پر مجبور ہو گئی۔ ابوجعفر منصور سے لے کر ہارون الرشید تک تمام عباسی حکمران اندرونی طور پر حنفی فقہا اور علماء کا زور توڑنے میں جب بری طرح ناکام ہو گئے تو حنفی فقہ اور حنفی فقہا کے بغیر نظام حکومت کے تاراج ہونے کا اندیشہ یقین سے بدل گیا۔ تب قاضی ابویوسف کو عام قاضی کے عہدے سے ترقی دے کر قاضی القضاۃ کا مقام دے دیا گیا۔ اور محکمہ عدلیہ کی مطلق العنان عدالت پر قاضی ابویوسف براجمان ہو گئے۔ جب مخالفین اور حاسدین نے قاضی ابویوسف کی ذمہ داریاں اور اختیارات دیکھے تو ہارون الرشید سے شکایت کی۔ ہارون الرشید نے جواب میں کہا۔

"خدا کی قسم علم کے جس باب میں بھی میں نے قاضی ابویوسف کو جانچا اس میں کامل اور ماہر پایا۔ میں آلودگیوں سے اس کے دین کو محفوظ پاتا ہوں آخر کوئی آدمی قاضی ابویوسف جیسا ہو تو پیش کرو"

عباسیوں کو تقریباً پانچ صدیوں تک حکومت کرنے کا موقعہ ملا۔ ۱۳۲ھ میں سفاح اول الخلفاء بنی عباس کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ اور مستعصم عباسی آخری خلیفہ ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ گویا ۵۲۴ سال عباسیوں کی اس دنیا میں حکومت رہی اور بغداد میں اس خاندان کے ۳۷ خلفاء گذرے۔ اس طویل ترین مدت میں ان کے قاضیوں خصوصاً قاضی القضاۃ کے عہدے پر سرفراز ہونے والوں میں عموماً حنفی مسلک کے پابند فقہا تھے۔ الاماشاء اللہ بعض خاص وجوہات سے دوسرے مسالک کے فقہا کو بھی کبھی کبھار مواقع ملتے رہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے جو کچھ سوچ کر وضع قوانین کی مجلس بنائی تھی خدا تعالیٰ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی اور ان کی مجلس کے

(باقی ص۵۵ پر)

ڈاکٹر رشید الوحیدی جامعہ ملیہ نئی دہلی

طلبۂ عزیز کے لئے لمحۂ فکریہ

تکلفات سے دور، سادگی کے ساتھ مسجدوں اور مدرسوں کے حجروں میں رہنے والے، علم دین کے طلبہ پوری توجہ سے علوم دینیہ کے حصول میں منہمک رہتے تھے ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد ہوتا تھا۔ اپنی درسی کتابوں کا مطالعہ، اور اس میں اس حد تک کمال پیدا کر لینا کہ موضوع سے متعلق اصول و فروع سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ اور پھر ان حکمتوں کو پوری طرح اخذ کر لیں جو ان کتابوں کی عبارت اور متن میں پوشیدہ تھیں۔ اس طرح قرآن، حدیث، فقہ، اصول اور دینی علوم کی جملہ شاخوں میں انہیں پورا پورا عبور حاصل ہو جائے۔

عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ اس طرح صرف کر کے جب یہ طلبہ فارغ ہوتے تھے تو ان کے دماغ علم کے خزانوں سے ان کا قلب خشیت الٰہی سے معمور و منور ہوتا تھا۔ وہ اقلیم علم کے بے تاج بادشاہ ہوتے تھے ان کو اپنے اندر کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا وہ اپنی علمی میراث پر مطمئن ہوتے تھے اپنے سیدھے اور سادے رہن سہن کے مقابلے میں کسی اور طرز معاشرت سے مرعوبیت کا انہیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔

یہ اس دور کی بات ہے جب انگریزوں کے تسلط سے قبل برصغیر میں شاہان مملکت اور والیان ریاست و امراء علوم کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد اس عہد کا بھی یہی حال تھا جب انگریزوں کے آنے کے بعد اکابرین مخلصین نے اپنے خلوص و عمل سے (بقاء اسلام و تحفظ علم کے لئے، یعنی ان مدرسوں کے) طلبہ میں دینی حمیت و احساس کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ جو برسہا برس چلتا رہا۔ پھر یکایک کایا پلٹ گئی۔ ایسا ہوا کہ ایک طرف تو دینی مدرسوں میں داخل ہونے والے طلبہ کے دلوں سے دینی تعلیم کی اہمیت ختم ہو گئی۔ وہ داخلے لے کر وقت تو گذارتے رہے۔ پڑھتے بھی رہے مگر ایمانداری کے ساتھ مطالعے اور انہماک کی وہ قدیم روش رخصت ہو چکی تھی۔ جو کچھ وہ پڑھ رہے تھے اس کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت ان کے قلوب میں نہیں تھی۔ الاّ ماشاء اللہ، مستثنیات کو چھوڑ کر عمومی حال یہی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب، کا سمجھنا تو الگ رہا کتابوں کی عبارت تک پڑھنا اور اس کا سمجھنا مشکل ہو گیا۔ اسی حالت میں وقت گذرتا رہا تعلیم و مدرسے کی مدت پوری کرنے کے بعد جب ان بے چاروں نے اپنا جائزہ لیا تو دل و دماغ علم سے خالی تھا، یعنی اس علمی سفر کا اختتام اس طرح سے ہوا کہ منزل پر خالی ہاتھ کھڑے تھے۔ اور اب ایک احساس محرومی اور احساس کمتری

دامنگیر تھا۔ محرومی کے احساس کا علاج تو اب ممکن نہ تھا۔ کہ عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ نکل چکا تھا۔ ہاں احساس کمتری سے چھٹکارا پانے کے لئے انہوں نے کشاں کشاں یونیورسٹیوں اور کالجوں کا رخ کیا۔

خیر! بات اچھی تھی، اب جہاں وہ آئے تھے وہ بھی بہرحال علم کا ایک بازار تھا۔ اگرچہ اس بازار کی جنس اس سے مختلف تھی جسے وہ چھوڑ کر یا طے کر کے آئے تھے۔

افسوس تو یہ ہے کہ یہاں وہ ایک دوسری قسم کے ادبار و ہلاکت کی نذر ہو گئے۔ یہ دردناک تفصیل بھی سننے کے قابل ہے۔

شروع ہی سے مدرسوں کے ماحول سے مرعوب و متاثر بھی تھے اور یہاں آنے کا ایک احریصانہ شوق ولولہ میں چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔

علم کی اس نئی بزم کا مزاج اور ماحول کچھ اس قسم کا ہے کہ بظاہر یہاں قدم قدم پر دامنِ دل کھینچنے والے نظارے، تفریح طبع کے لئے نئے نئے مناظر ہیں۔ ہر قسم کی آزادی ہے۔ مدرسوں کے ماحول میں جن جن گوشوں سے بچ بچ کر چلنا سکھایا گیا تھا۔ وہ یہاں ایک عام بات ہے۔ مدرسے میں جن چیزوں پہ پابندی تھی وہ یہاں تفریح ہے۔

مدرسے سے آنے والے طلبہ بہرحال جوان ہیں۔ اب تک ایک مخصوص اقدار و اطوار کی پابندیوں میں شب و روز گذار رہے تھے۔ اچانک انہیں آزادی کی فضا نصیب ہوئی۔ تو آہستہ آہستہ پر پرزے نکلنے لگے۔ بظاہر کوئی روکنے والا نہیں۔ اندر کی فضا اس قسم کی ہے کہ کبھی احساس ہوا بھی تو اسے دبا دیا۔ اپنے مقصد کو بھول گئے اور اب تک کی جکڑبندیوں کا سارا کفارہ ادا کرنے لگے۔ ہائے افسوس! مدرسے میں غفلت کے نتیجے میں جو محرومی ہاتھ آئی تھی اس سے بھی سبق نہ لیا۔ یہاں عقیدے کی آزادی، فکر و نظر کی آزادی، معاشرت، رہن سہن، نشست و برخواست کی آزادی، یہاں کی راہ و رسم، تفریح اور طالب علمی کے مشاغل مدرسوں سے قطعی مختلف، بالکل جدا، اس موقع پر خیال آتا ہے، حسرت ہوتی ہے، اگر مدرسوں کے روحانی نغمے اور سرمدی لے سے ان کے دل و دماغ کی سرشاری، اور وہاں کے نصاب سے ان کے فکر و شعور کو استقامت و پختگی ملی ہوتی، اور اے کاش، اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی صحبت سے، اچھے برے میں تمیز کرنے کا سلیقہ ہی سیکھ لیا ہوتا۔ تو وہ اس نئی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد، یہاں کے ماحول، آزادی اور زندگی کی اس تبدیلی پر ایک منٹ رک کر ٹھٹھک کر غور کرتے اور پھر ہر "ماکدر" سے بچتے ہوئے "ماصفا" کو حاصل کرنے میں لگ جاتے کیونکہ بہرحال اس بظاہر گدلے سمندر کی تہہ میں موتی بھی تھے۔ ان کو حاصل کرنے کے لئے شرط فنکارانہ اور ماہرانہ غواصی کی تھی۔ نہ کہ سطح آب پر تیرتے رہنے کی۔ کاش ہمارے طلبہ سنجیدگی سے یہ غواصی شروع کرتے۔ ان یونیورسٹیوں کے نصاب ہی کو غور و فکر سے حاصل کرتے، نئے تقاضوں سے باخبری کے بعد دینی اور اسلامی روایات کی روشنی میں مسائل کے حل کی بات سوچتے۔ داد تحقیق دیتے، تو یہ ایسا کام تھا کہ ملت اس کے احسان و تشکر سے صدیوں عہدہ برآ نہ ہو سکتی۔

اور صحیح معنوں میں "میدان علم" کے یہ مجاہد اپنے اکابر کے سچے وارث و جانشین ہوتے۔ مگر ہوا کیا! مدرسے میں رہتے ہوئے وہ مرعوبیت کی فضا میں گم ہو گئے۔ وہاں کے ہیرے کو کھوٹا سکہ سمجھ کر بے اعتنائی برتی اور اغیار کی ہر چمکدار شئے کو سونا سمجھا نتیجہ ظاہر تھا۔ مدرسے کے قیمتی ورثے سے محروم رہ گئے۔ اور اب وہ بصیرت جو اس وقت ان کی دستگیری کرتی، مفقود ہے۔

تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ایسے طلبا خود کو نئے ماحول میں فٹ کرنے اور یہاں کی آزادی سے لطف اندوز ہونے کے لئے عجیب عجیب افسوسناک اور چھچھوری حرکتیں کرتے ہیں۔

سب سے پہلے دبے دبے لفظوں میں اپنے مدرسوں، وہاں کے نصاب اور اساتذہ کی تخفیف، وہی گھسے پٹے فرسودہ، ریمارک۔ "ارے بھائی! ہمارے مدرسے کا ماحول پرانا اور اساتذہ بڑے متشدد، دقیانوسی اور پرانے خیالات کے ہیں"۔ کبھی دونوں اداروں کے نصاب کا مقابلہ، پھر مقابلے میں مدرسے کے نصاب کی بے وقعتی۔ انہیں اتنی بھی تمیز نہیں رہتی کہ اپنی جگہ وہ نصاب بھی قیمتی اور اہم ہے، اور یہ نصاب بھی فائدے سے خالی نہیں ہے (دونوں کا مقابلہ کیا) اور جناب آپ وہاں کے نصاب کے فیض سے تو محروم رہ گئے۔ یہیں بتا رہے ہیں کہ یہاں کے نصاب کا بھی اللہ ہی مالک ہے۔ آگے چلئے عقیدے اور احکام و مسائل میں گفتگو۔ علم تو خام ہے۔ چنانچہ ایسی بحث اور موشگافیاں کہ بعض اوقات عقیدے کی بنیاد ہی منہدم ہو چلی اور انہیں کچھ پتہ نہیں۔

معاشرتی تبدیلی کا حال اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ سب سے پہلے شرافت و وقار کی نشانی "ٹوپی" پر مصیبت آئی، انگریزی بال۔ عمدہ کٹنگ، کنگھے سے آراستہ بالوں پر ٹوپی بھلا کیا اچھی لگے گی۔ چلئے صاحب کالج میں۔ مولانا صاحب ننگے سر گھومنے لگے۔ پھر داڑھی بے چاری جو ڈبکی سہمی پڑی ہوئی تھی وہ "ماڈرن ازم" اور اسمارٹ بننے میں ایک بڑی رکاوٹ نظر آئی۔ ایک دن ہلکی ہوئی۔ دوسرے دن صاف۔ اور اب ہر روز مولانا صاحب صبح صبح منہ پر صابن کے جھاگ کا لیپ کرکے بلیڈ سے کھال کھرچتے ہوئے بزعم خویش سرشار و مطمئن نظر آتے ہیں۔ کہ:۔

"میں نے فرسودہ روایات کو لات ماردی۔ اب میں بڑی ترقی یافتہ، وسیع النظر اور بیدار ذہن ہو گیا ہوں۔ دنیا کے INTELUCTUAL اور دانشوروں میں میرا بھی شمار ہونے لگے گا ع

ہائے بیچارے کے اعصاب پہ "فیشن" ہے سوار"

اور اس کے بعد دوسرے لوازمات، لیکچر، کلچرل، پروگرام، پکنک، غرض کہ لان، سڑک، کنٹین، بسوں اور بازاروں میں خفیف حرکتوں سے عالمانہ، بلکہ شریفانہ وقار کے لاشے بے گور و کفن پر نفرت و تضحیک وہ کوڑے برسائے کہ رہے نام اللہ کا۔ خلاصہ یہ کہ ہر ہر موقع پر اپنی "مولویت" اور "فاضل" ہونے کا الزام کھرچ کھرچ کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ ساتھی خصوصاً قریبی دوست، دقیانوسیت، ملائیت اور "لکیر کے فقیر" ہونے کا الزام نہ دے دیں۔

آپ سوچیں گے، رہن سہن، تفریح وغیرہ میں آزادی اور تبدیلی بھی کوئی قابلِ گرفت چیز ہے جس کا اتنا طومار

باندھ دیا، بے شک تسلیم اس اعتراض میں، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں ۔مگر مسئلے کو اس انداز سے سوچیئے کہ ایک انسان جس نے اپنی قیمتی زندگی کے کتنے ماہ و سال اپنی غفلت کے نذر کر دیئے اور اب وہ اس کی تلافی کرنے کے لئے پھر سے ایک نیا قدم اٹھا رہا ہے ۔اور اب بھی وہ بجائے اپنے اصل مقصد اور کام کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کے پھر بھٹک گیا ہے ۔اس صورت حال میں اس کی یہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں کہیں پھر اُسے ندامت و پشیمانی کے گڑھے میں ڈال دیں ۔یہ مفروضہ اور امکان نہیں ہے ۔تجربہ اور مشاہدہ ہے ۔ایک جگہ یہ غریب مرعوبیت اور غفلت میں مارا گیا ۔اب جو بچا کھچا عمر عزیز کا حصہ ہے ان حماقتوں کی نظر ہو رہا ہے ۔

اب ہم اس درد بھری داستان کو سمیٹتے ہوئے عرض کریں گے کہ طلبہ کا تو یہ حال ہے ۔ادھر قدیم و جدید نصاب پر غور کرنے والے، دینی مدارس اور عصری یونیورسٹیوں کو قریب لا کر ایک نیا اور مفید پہلو تلاش کرنے والے، دینی نصاب میں ترمیم و تبدیلی کر کے اسے تقاضوں کے مطابق بنانے والے بے چارے شب و روز اپنا دماغ کھپا رہے ہیں ۔کانفرنسیں اور ورکشاپ کر رہے ہیں ۔تنظیم اور ادارے بنا کر اس موضوع پر سیمینار کر رہے ہیں ۔آخر بات بنے تو کیسے ؟

میں نے کسی جگہ مستثنیات کا ذکر کیا ہے ۔جی ہاں، ایسے طلبہ میرے سامنے ہیں ۔دینی اور عصری درسگاہوں میں ایسے لوگوں سے مل چکا ہوں ۔مدرسوں میں ایسے علماء موجود ہیں جو ادارے کی لاج اور دارالعلوم کے لئے باعث فخر ہیں علوم دینی میں ان کی تحقیق اور معلومات کا یہ حال ہے کہ جس موضوع پر زبان و قلم کو حرکت دیں، علم و حکمت کا چشمہ ابل پڑے اسی طرح یونیورسٹیوں میں ان سنجیدہ باوقار STUDENT سے مل کر دل خوش ہوا ۔جو رہن سہن اور عام زندگی میں نہایت سادہ و مہذب، اور کسی علمی سوسائٹی ۔کلاس یا عام ملاقات میں سائنس، انگریزی ادب، جغرافیہ، اکنامکس جس موضوع پر گفتگو کریں وسیع و عمیق مطالعے کا اندازہ ہوتا چلا جائے ۔یہی نہیں عالمی سیاست، سیاسیات حاضرہ، سماجی، مذہبی اخلاقی موضوعات پر نئی سے نئی معلومات سے ایک نئی روشنی حاصل ہو جائے ۔

اس لئے ضرورت ہے حساس دل، بیدار ضمیر، دیانتداری اور وقت کی ضرورت اور قدر و قیمت کا احساس لے کر ہمارے طلبہ تحصیل علم کا پاکیزہ فرض ادا کریں ہر دو نصاب کا حق ادا کریں اور پھر اس طرح نکھر کر سامنے آئیں کہ اسلام اور انسانیت دونوں کے لئے وجہ افتخار ہوں ۔دونوں کی خدمت ہر دور اور تقاضے کے مطابق انجام دے سکیں ۔

ایک ہاتھ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ اخلاق اور شریفانہ زندگی کی امانت ہو دوسرے ہاتھ میں وقت کی گتھیوں کو سلجھانے کا ایسا معقول اور مدلل حل ہو جو ہر فکر اور ہر ذہن کے لئے قابل قبول ہو سکے ۔اور میں صاف عرض کر دوں، یہ کام انہی حوصلہ مند نوجوانوں کا ہو گا جن کو ایک طرف علم دین کے تمام گوشوں میں مہارت ہو ۔دوسری طرف نئے علوم اور نئے افکار سے مکمل آگاہی و باخبری ہو ۔

اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے ۔

جناب طالب ہاشمی صاحب
۱۸ اڑی رضوان بلاک اعوان ٹاؤن، ملتان روڈ لاہور ۱۸

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

ادارہ کا مضمون نگار کی آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں

جناب مکرم و معظم زاد شرفکم - السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

گرامی نامہ کے لیے صمیم قلب سے سپاس گذار ہوں لیکن ساتھ ہی حیران ہوں کہ اس معاملہ میں آپ نے مجھ جیسے غیر معروف گوشہ نشین آدمی کو تخاطب کے قابل کیسے سمجھا۔ کسر نفسی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ میرا علم قلیل اور میری عقل بہت محدود ہے، میں تو آپ جیسے علماء کے خوانِ علم کا ایک ادنیٰ ریزہ چین ہوں۔ جن اکابر کے اسمائے گرامی آپ نے تحریر فرمائے ہیں انہیں تو حقیقی معنوں میں ارباب علم و فضل کہا جا سکتا ہے، مجھ جیسے نالائقوں کی ان سے کیا نسبت ؟ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

عرصہ سے بہت کم لکھ رہا ہوں، مطالعہ بھی بہت کم رہ گیا ہے کیونکہ آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے۔ بینائی کی کمزوری، بڑھاپے کی آمد آمد اور مصائب و آلام نے اس قابل نہیں چھوڑا کہ آپ کے سوالات کا مفصل جواب لکھ سکوں لہٰذا امتثال امر کے طور پر چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان کی یہ حیثیت نہیں کہ یہ الحق جیسے وقیع ماہنامہ یا کسی کتاب میں جگہ پا سکیں۔

(۱) میں نے اپنی علمی زندگی میں بے شمار ارباب علم و فضل کی تصنیفات سے استفادہ کیا ع

تمتع ز ہر گوشہ یافتم

قرآن، حدیث اور تاریخ (از ابن سعد، طبری، ابن خلدون، ابن اثیر وغیرہم) کے بعد ماضی قریب اور دور حاضر کے جن ارباب علم کی کتابوں کا مطالعہ کیا اُن میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں :۔۔۔۔۔ حالی، شبلی، مولانا اشرف علی تھانوی رح، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، قاضی سراج الدین احمد مرحوم، سید سلیمان ندوی رح، محمد حسین آزاد، علامہ اقبال رح، مولانا محمد ابراہیم میر رح سیالکوٹی، مولانا عبدالسلام ندوی رح، ریاست علی ندوی، حاجی معین الدین احمد ندوی رح، شاہ معین الدین احمد ندوی رح، سعید انصاری رح، مولانا ظفر علی خان رح، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالحی، مولانا ابوالکلام آزاد رح، مولانا مناظر احسن گیلانی رح، مولانا منظور نعمانی، مولانا قاضی سلمان منصور پوری رح، مولوی عبدالحق مرحوم، سید قطب شہید مصری رح، مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی رح (نواب صدر یار جنگ رح)، عنایت اللہ خان مشرقی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رح، مولانا قاری محمد طیب رح، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا صباح الدین صاحب

ملک نصر اللہ خان عزیزؒ، مولانا ماہر القادریؒ، مولانا عامر عثمانیؒ، آغا شورش کاشمیریؒ، الیاس برنیؒ وغیرہم۔

ان مشاہیر کے علاوہ بہت سے غیر معروف مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جن میں غیر مسلم اہل قلم اور مستشرقین بھی شامل ہیں۔ فارسی میں رومیؒ، سعدیؒ، جامیؒ اور اقبالؒ کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ——— اسلام سے والہانہ محبت تو خاندان کے دینی ماحول نے پیدا کی۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے علم و ادب کا ذوق پیدا ہوا اور تحقیق و تفحص کا جذبہ بیدار ہوا۔

(۲) ان مصنفین اور ان کی کتابوں کی خصوصیات بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ان کتابوں میں علم و ادب کی چاشنی بھی ہے اور دینِ حق کے بارے میں گرانقدر معلومات بھی، تاہم ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

(۳) معارف اعظم گڈھ، برہان دہلی، الفرقان لکھنؤ، منادی دلی، عصمت دلی (پھر کراچی) مولوی دلی، پیشوا دلی، نظام المشائخ دلی (پھر کراچی) ساقی دلی (پھر کراچی) ترجمان القرآن لاہور، نیرنگ خیال لاہور، ہمایوں لاہور، عالمگیر لاہور، ادب لطیف لاہور، خدام الدین لاہور، چٹان لاہور، رحیق لاہور، فاران کراچی، المعارف لاہور، صحیفہ لاہور، جامعہ دلی، البلاغ کراچی، بینات کراچی، اردو کراچی، اردو نامہ کراچی، نقوش لاہور، اوراق لاہور، فنون لاہور، مدینہ بجنور، الحق اکوڑہ خٹک، الخیر ملتان، الاعتصام لاہور، محدث لاہور، اردو ڈائجسٹ لاہور، سیارہ ڈائجسٹ لاہور، قومی ڈائجسٹ لاہور، زندگی لاہور، ایشیا لاہور وغیرہ

موجودہ صحافت میں کوئی روزنامہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا ——— ہفت روزہ پرچوں میں الاعتصام لاہور، ایشیا لاہور اور تکبیر کراچی اچھے پرچے ہیں ——— ماہانہ پرچوں میں معارف اعظم گڑھ، برہان دہلی، الفرقان لکھنؤ، الحق اکوڑہ خٹک، ترجمان القرآن لاہور، البلاغ کراچی، بینات کراچی، الخیر ملتان، بتول لاہور، الحسنات لاہور، المعارف لاہور اور نقوش لاہور اچھے پرچے ہیں۔ میثاق لاہور اور تدبر لاہور بھی ان میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

(۴) میں نے غیر معروف درسگاہوں میں، جو مسجدوں میں قائم تھیں، دینی تعلیم حاصل کی۔ میرے اساتذہ علماء کے گلیم پوش بوریا نشین گروہ سے تعلق رکھتے تھے، بالکل غیر معروف لیکن علم و فضل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے کوہ ہمالہ سے بھی بلند۔ وہ شاگردوں کو اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر سمجھتے تھے، درس و تدریس کا کوئی معاوضہ لینا ان کے نزدیک حرام تھا ——— مسجد، درسگاہ اور اس کی چٹائیاں، اساتذہ اور شاگردوں کی نشستیں ——— لیکن اب وہ دور ہی لد گیا۔

(۵) اس ناچیز کی رائے میں دورِ حاضر کے اہلِ علم میں سے (بعض بنیادی عقائد اور آراء میں اختلاف کے باوصف) سید قطب شہید مصریؒ، علامہ طنطاویؒ، سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا محمد حنیف ندویؒ، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد تقی عثمانی، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

مولانا حامد الانصاری، مولانا حبیب الرحمن اعظمی، ڈاکٹر نور محمد غفاری اور ڈاکٹر اسرار احمد کی کتابیں بہت مفید ہیں۔

(۶) پیراشہ میں جن اہلِ علم کا ذکر کیا گیا ہے ان میں الیاس برنیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، علامہ اقبالؒ، اکبر الہ آبادی مرحوم، علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم، شورش کاشمیریؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور پیر محمد کرم شاہ الازہری کا اضافہ کر لیجیے ——— مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کا قلم اباحیت، تجدد، مغربیت، ماڈرنزم وغیرہ کے بارے میں شمشیرِ قاطع کی حیثیت رکھتا تھا لیکن افسوس کہ مولانا تھانویؒ کے مرید ہونے کے باوجود وہ قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔

(۷) مذکورہ بالا اصحاب کی تحریریں ان مسائل کے بارے میں بہت کار آمد ہیں۔

(۸) مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصاب میں اگر جدید علوم (سائنسی اور فنی) نیز عربی کے علاوہ دوسری زبانوں (فارسی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمن وغیرہ) کی تعلیم بھی شامل کر دی جائے تو بہت مفید نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کو جدید عربی سے روشناس کرانا بھی ضروری ہے۔

سب سے اہم چیز سیرت و کردار کی تعمیر ہے، ان مدارس کا مقصد محض "مولوی" تیار کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ یہ کہ طلبہ اسلام کے جانباز سپاہی اور نہایت حق گو اور مخلص علمائے باعمل بنیں۔

والسلام مع الاکرام

ناچیز طالب ہاشمی غفرلہٗ

سوالنامہ:- (۱) آپ کو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے۔ (۲) ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیت۔ (۳) کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا، موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ (۴) آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لیے۔ ایسے اساتذہ اور درس گاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلبہ کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی۔ (۵) اس وقت عالمِ اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے اس کے لیے قدیم یا معاصر اہلِ علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ (۶) علمی اور دینی محاذوں پر کئی فتنے تحریفی، الحادی اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکارِ حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدد، مغربیت، قادیانیت اور ماڈرنزم) مصروف ہیں۔ ان کی سنجیدہ علمی احتساب میں کون سی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی راہنمائی کر سکتی ہیں۔ (۷) موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کون سی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ (۸) مدارسِ عربیہ کے موجودہ نصاب اور نظامِ تعلیم میں وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو اسے مؤثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں ——— امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی
رُوح افزا
تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو، کیسی ہی محفل ہو،
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔
فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں لازوال۔
ہر محفل کا میزبان خصوصی
ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں
رُوح پاکستان۔ رُوح افزا
راحت جان۔ رُوح افزا
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
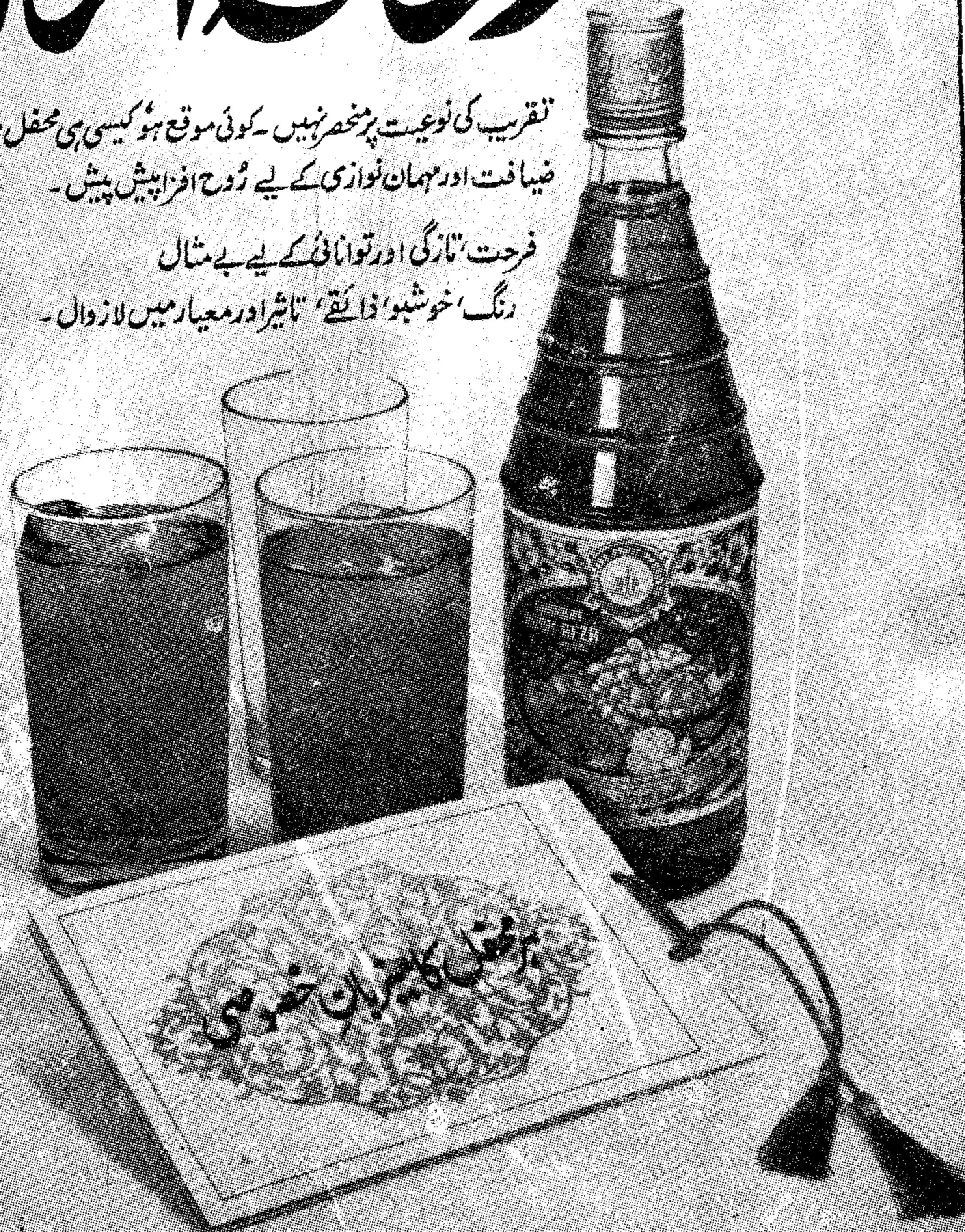
ADARTS

6/87

جناب خلیل الرحمٰن سجاد ندوی

۱۲؍فروری کو کچھ نوجوان راقم الحروف کے پاس آئے، انہوں نے کہا:

"مولانا! سلمان رشدی کی "شیطانی آیات" کا آجکل بہت چرچا ہے، ہم لوگ اس بارے میں کیسا طرزِ عمل اختیار کریں؟"

اس سوال کے جواب میں میں نے ان نوجوانوں سے جو گفتگو کی اسے انہوں نے ریکارڈ کر لیا۔ اس کے دو تین دن بعد جب میں نے حضرت والد ماجد مدظلہ سے دریافت کیا کہ اس مرتبہ نگاہِ اولین کے صفحات میں مجھے کیا لکھنا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ابھی تک "الفرقان" کے صفحات میں سلمان رشدی کی شیطنت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے، اب جو صورتحال اس مسئلہ نے اختیار کر لی ہے اس کے پیشِ نظر امت کی اور دنیا کی خیر خواہی کا یہ تقاضا ہے کہ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی جائے، لہٰذا بہتر ہے کہ اس شمارہ میں تم اسی پر کچھ لکھو۔ میں نے مناسب سمجھا کہ جو گفتگو میں نے ان نوجوانوں سے کی تھی اسی کو قدرے حذف و ترمیم کے ساتھ الفرقان کے ان صفحات میں منتقل کر دوں۔ شاید گفتگو کا بے تکلف انداز قارئین کو بھی زیادہ دلچسپ اور مؤثر محسوس ہو، چنانچہ ذیل کی سطروں میں وہی گفتگو پیشِ خدمت ہے:-

میں نے ان نوجوانوں سے کہا:

سب سے پہلے تو آپ یہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہمارے ماں باپ اور دل و جان آپ پر قربان ہوں) کو محبوبیت کا وہ "مقامِ محمود" عطا فرمایا ہے جو ہزاروں دوسری خصوصیات کی طرح صرف آپ ہی کا حصہ ہے

ایک عامی مسلمان گنہگار کے دل میں بھی آنحضرتؐ کے ساتھ عقیدت و محبت کے ایسے جذبات چھپے ہوتے ہیں ــــــ جن کا بعض وقت دوسروں کو تو کیا خود اس شخص کو بھی احساس نہیں ہوتا، جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی بدبخت اس مبارک ہستی کو تنقیص و ملامت یا سب و شتم کا نشانہ بناتا ہے یا آپؐ کی بے آبروئی کی کوشش کرتا ہے تو وہ لوگ بھی جو بظاہر بس نام کے مسلمان نظر آتے ہیں، آپے سے باہر ہونے لگتے ہیں اور ناموس رسولؐ کے تحفظ کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ بے شمار حوصلہ شکن اور مایوس کن علامتوں کے درمیان یہ ایک بات ہے جو امید افزا ہے۔ جب تک یہ باقی ہے اور جب تک محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے ساتھ محبت کا یہ نورانی دھاگہ سلامت ہے تب تک گویا ہمارے پاس دلوں کے تالوں کو کھولنے کی ایک چابی موجود ہے۔ جس دن دل اس بچے کھچے سرمایہ سے بھی خالی ہو جائیں گے اُس دن ایک بڑی نعمت سے ہم محروم ہو جائیں گے، اور پھر نام کے مسلمانوں کو کام کے مسلمان بنانے کا کام پہلے سے زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک بات اور قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام کے دشمنوں کی ہر زمانہ میں یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں اور دنیا کے عام انسانوں کے درمیان کسی نہ کسی مسئلہ پر لڑائی ٹھنی رہے تاکہ حریفانہ کشمکش اور مقابلہ کی نفسیات سے متاثر ہو کر ایک طرف تو مسلمانوں کے اندر ایسی ہیجانی کیفیت بلکہ چڑچڑاپن جڑ پکڑ جائے کہ وہ ہمدردی و شفقت اور معتدل مزاجی کے ساتھ دعوت الی اللہ کا وہ کام نہ کر سکیں جس سے دشمنانِ اسلام ہر وقت خوفزدہ رہتے ہیں، کیونکہ بار بار کے تجربوں سے وہ یہ حقیقت خوب سمجھ گئے ہیں کہ مسلمانوں کی مضبوطی اور عزت و سربلندی کا اصل میدان دعوتِ حق ہے اور وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جن کروڑوں انسانوں کو انہوں نے مختلف تدبیروں سے اسلام سے بدظن کر رکھا ہے، اگر مسلمانوں کے مزاج میں اعتدال آگیا اور انہوں نے دعوت الی اللہ کے چھوٹے ہوئے کام اور ذوق و مزاج کو پھر سے اپنا لیا اور اس کے نتیجہ میں اسلام کی صحیح دلآویز اور پرکشش تصویر ان انسانوں کے سامنے آگئی تو پھر اسلام کے سیلِ رواں کو تھامنا ان کے بس سے باہر ہو جائے گا۔

آپ جانتے ہوں گے کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک باب اسپین (اُندلس) سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا کے اس خوبصورت زرخیز اور مختلف پہلوؤں سے خصوصی اہمیت کے حامل خطہ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ بڑی عبرتناک اور سبق آموز ہے۔ میں اس وقت اس تاریخ کا صرف ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں:۔

۸۲۳ء سے ۸۵۲ء تک وہاں کا حکمران عبدالرحمٰن الثانی تھا، مؤرخین لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن الثانی کا یہ دورِ حکومت مسلم اُندلس کی سیاسی و ثقافتی شان و شوکت کے عروج کا دور ہے۔ لیکن اس عہد کے آخری حصہ میں ایک خطرناک فتنہ برپا ہوا جس نے آگے چل کر اُندلس میں اشاعتِ اسلامی اور حکومتِ اسلامی ہی کو نہیں بلکہ اسلامی وجود کو بھی سخت نقصان پہنچایا ــــ

ہوا یہ کہ کچھ عیسائی پادریوں کے اکسانے پر کچھ پرجوش عیسائیوں نے اجتماعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ایک مہم شروع کی، وہ لوگ جلوس کی شکل میں سڑکوں پر نکلتے اور کھلم کھلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم اور توہین و تمسخر کا نشانہ بناتے۔ "انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا" کے مقالہ نگار نے اس واقعہ کے تذکرہ کے ضمن میں لکھا ہے کہ:۔

'Abd ar-Rahman II sought to persuade the 'Criminals' to retract, by alleging some pretext or by affirming that the insult had been pfofeered involuntarily. Failing in this effort he was obliged to impose the death penalty.

"عبد الرحمن الثانی نے یہ کوشش کی کہ مجرمین کوئی حیلہ بہانہ کرکے یا یہ اعتراف کرکے کہ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا جرم مجبوراً سرزد ہوا ہے اپنی گستاخی سے توبہ کرلیں۔ لیکن جب اسے اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تو مجبوراً اسے اُن کو سزائے موت دینی پڑی"

آگے چل کر اسی مقالہ نگار نے ایک بہت اہم بات یہ کہی ہے کہ توہین رسالتؐ کے جرم کی سزا پانے والے بہت سے جوشیلے عیسائی ایسے بھی تھے جو پادریوں کے جوش دلانے سے (بزعم انکے) شہید تو ہو گئے، لیکن کلیسا نے ان کے شہید ہو جانے کے بعد ان کے معاملہ سے بالکل لاعلمی اور بے تعلقی ظاہر کی۔

This persecution provoked by the christians themselves, took a toll of 53 victims, the last of whom found themselves avowed by their own ecclesiastical authorities.

مجھے یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ متعدد شواہد سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ شانِ رسالتؐ میں گستاخی کی اس منظم کوشش کے پیچھے اسپین میں حکمران مسلمانوں اور عیسائی عوام کے درمیان مستقل طور پر نفرت و عداوت کی دیوار کھڑی کر دینے کا ایک شیطانی منصوبہ تھا جو آگے چل کر پوری طرح کامیاب ہوا اور بالآخر وہاں اسلامی اقتدار ہی نہیں اسلامی وجود ہی کا خاتمہ ہو گیا۔

اسی طرح کا ایک تجربہ اسی صدی میں ہمارے برصغیر میں بھی ہو چکا ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کی بات ہے کہ عظیم تر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اہل دل علماء ربانیین کی کوششوں سے یہاں کے سادہ دل عوام خاصی تیز رفتاری سے اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اور یہ بات اُن انگریزوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی جن کے یہاں آنے کا بڑا مقصد یہاں کے عوام اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرکے اشاعتِ اسلام کے کام کو روکنا تھا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں ایسی کئی کوششیں کی گئیں جن کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اشتعال

دلایا جائے، اور یہاں کے مقامی باشندوں اور مسلمانوں کے مابین منافرت پھیلائی جائے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر جو طریق کار اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ کسی شردھانند، کسی راجپال یا کسی نا تھورام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر (نعوذ باللہ) کیچڑ اچھالنے اور آپ کی بے آبروئی کرنے پر آمادہ کیا جاتا، اس کے نتیجہ میں مسلمان مشتعل ہوتے اور بس کارروائیوں اور جوابی کارروائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا، اور یہ نتیجہ ضرور نکلتا کہ اشاعت اسلام کا کام رک جاتا۔

ہمارے زمانہ میں دشمنوں کی تمام تدبیروں اور اپنی تمام تر غفلت و کوتاہی کے باوجود عالمی سطح پر اسلام کی پیشقدمی جس انداز سے جاری ہے دشمنان اسلام اس پر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ اس کا یہ تقاضا فطری ہے کہ ان کی طرف سے مسلمانوں اور عام انسانوں کے درمیان منافرت کی آگ از سر نو بھڑکانے کی کوششوں کا نیا سلسلہ شروع ہو۔ ہمارے نزدیک سلمان رشدی کی "شیطانی آیات" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ بات کہ عالمی سطح پر اسلام آگے بڑھ رہا ہے، خیالی دنیا کی بات نہیں ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ وہ دنیا اب آپ لوگوں کے لیے بالکل اجنبی نہیں رہی ہے جہاں ٹھوس حقیقتوں کا خود مشاہدہ و تجربہ کیا جاتا ہے اور یہاں کی خبروں سے وہ لوگ بڑی حد تک بے خبر ہی رہتے ہیں جن کی معلومات کا زیادہ تر انحصار اخبارات وغیرہ دیگر ذرائع ابلاغ پر رہتا ہے۔ پس آپ لوگوں کیلئے اس بات پر یقین کرنا انشاء اللہ بہت آسان ہوگا کہ عصر حاضر میں ہزار دشواریوں اور نامساعد حالات کے باوجود دعوت و اشاعت کے میدان میں بحمد اللہ اسلام سب سے آگے ہے، تاہم جو تھوڑی سی مرعوبیت موجودہ ذرائع ابلاغ کی ابھی آپ کے دل میں باقی رہ گئی ہو، اس کی رعایت کر کے میں آپ کو چند اخباری تراشے بھی دکھانا چاہتا ہوں۔

یہ دیکھئے آپ کے سامنے یہ جو تراشہ ہے یہ مشہور برطانوی اخبار (GUARDIAN) کے شمارے بابت ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء کا ہے اس میں اخبار کے مذہبی امور کے مراسلہ نگار کے قلم سے ایک رپورٹ چھپی ہے جس کا عنوان ہے PEWER IN CHURCH AS MOSQUES FLOURISH "مسجدوں میں اضافہ اور گرجوں میں کمی"۔ (یہ رپورٹ اخبار کے پورے کالم میں چھپی ہے، اس کا صرف ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے)

Christian church membership declined to just under 7 million last year, compared with nearly 7.5 million in 1980 and 8.5 million in 1970. The number of mosques increased from four in 1960 to 814 last year.

"برطانیہ میں کلیسا کے ممبروں کی تعداد ۱۹۷۰ء میں ۸۵ لاکھ تھی، ۱۹۸۰ء میں یہ تعداد ۷۵ لاکھ رہ گئی، اور گذشتہ سال ۱۹۸۵ء میں تو یہ تعداد ۷۰ لاکھ سے بھی کم رہ گئی۔ (اس کے برخلاف) ۱۹۶۰ء میں برطانیہ میں کل ۴ مسجدیں تھیں، اور ۱۹۸۵ء تک برطانیہ میں مسجدوں کی تعداد ۸۱۴ تک پہنچ چکی تھی۔"

یہ دوسرا تراشہ "ہندوستان ٹائمز" کے شمارے بابت ۱۱ دسمبر ۱۹۸۶ء کا ہے۔ اس میں ایک رپورٹ زیر عنوان
(ISLAM IN FRANCE) "فرانس میں اسلام" چھپی تھی، اس رپورٹ کے یہ جملے خاص طور سے قابل غور ہیں :۔

Islam has adehugestride in France, with mosques spreading across the landscape and increasingly self-assurt Muslimdemanding recognition that this is now a partly Muslim country. InteriorMinister Charles Pasqual asinstructed his staff to prepare him a report on thi strangenew Franceof theusand Mosques detailing the influence of Islam fundamentalist, The newspaper and broadcasting hane also discovered the Islamic French thanks to a major new book by a specialistin islamic studies and political science professor, Gilles Kepel.

"فرانس میں اسلام تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، ملک میں ہر طرف مسجدیں بن رہی ہیں اور مسلمان بڑھتی ہوئی خود اعتمادی کے ساتھ اب یہ تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ فرانس اب جزوی طور پر ایک مسلم ملک ہے۔ فرانسیسی وزیر داخلہ نے اپنے عملہ سے کہا ہے کہ وہ "ایک ہزار مسجدوں والے اس نئے اور عجیب و غریب فرانس" کے بارے میں اپنی مفصل رپورٹ پیش کریں جس میں اسلامی بنیاد پرستی کے اثرات کی پوری تفصیل درج ہو"

آگے چل کر اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ :۔

"گزشتہ ۱۵ سال میں مسجدوں اور عبادت گاہوں کی تعداد تقریباً ایک درجن سے بڑھ کر ایک ہزار (۱۰۰۰) تک پہنچ گئی ہے"

اس رپورٹ کے مطابق فرانس میں گزشتہ ۱۵ سال کے دوران مسلمانوں کی تعداد میں تو کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوا، البتہ خود مسلمانوں میں کافی تیز رفتاری کے ساتھ بیداری بڑھی ہے۔

اسی طرح کی ایک رپورٹ مشہور بین الاقوامی رسالہ (TIME) کے ۲۳ مئی ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں (AMERICANS - FACING TOWARDS MECCA) کے زیر عنوان چھپی تھی، جس سے امریکہ میں اشاعت اسلام اور مسلمانوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں امریکی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کے مختلف اسباب کے تذکرہ کے بعد کہا گیا ہے :۔

U.S. Muslims are expected to surpass Jews in number and in less than 30 years become the countrys second largest religious community after Christians.

"امریکی مسلمانوں کی تعداد مستقبل میں یہودیوں سے بڑھ جانے کی امید ہے، توقع ہے کہ آئندہ ۳۰ سال میں مسلمان، عیسائیوں کے بعد ملک کی سب سے بڑی آبادی ہو جائیں گے"۔

یہ تو ہوئی اخباری اطلاعات کی بات! میں یہ بات پھر دہراتا ہوں کہ ہم لوگ نہ اخباری خبروں کو پوری طرح قابلِ اعتماد سمجھتے ہیں اور نہ بحمداللہ صورتحال سے باخبری کے لیے ان ذرائع ابلاغ کے محتاج ہیں جن پر اس وقت بڑی حد تک یہودیوں اور اسلام دشمن طاقتوں کا قبضہ ہے۔ ہمیں اپنے براہ راست مشاہدہ و تجربہ اور دنیا کے چپہ چپہ میں براہ راست رابطہ والی اور خالصۃً عملی جدوجہد کرنے والے ہزاروں بندگانِ خدا کی کارگذاریوں کے ذریعہ دنیا کی صورتحال کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے اس کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک طرف تو دائیں بائیں مختلف قسم کے نظاموں کو برتنے کے باوجود اپنے خوابوں کو پہلے سے زیادہ تشنۂ تکمیل دیکھ کر اور اپنی روح کی روز افزوں پیاس سے بُری طرح پریشان ہو کر دنیا کے عام انسان اسلام ہی کو اپنے درد کا درماں سمجھنے لگے ہیں ...... اور دوسری طرف مسلمانوں کے سنجیدہ طبقے میں روز بروز یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ ہمارے مسائل کا حل اور ہماری جدوجہد اور تگ و تاز کا اصل میدان صرف اور صرف دعوت الی اللہ ہے۔ سیاسی شور و غل اور ہنگامہ آرائی سے ہمارے مسئلے اور الجھتے جا رہے ہیں --- اور اگر کچھ مدت تک یہ ماحول برقرار رہ گیا تو دو اور دو چار کی طرح اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کے مزاج میں اعتدال آجائے گا اور دعوتِ اسلامی کے آگے بڑھنے کے لیے ماحول مزید سازگار ہو جائے گا، اور یہی وہ نتیجہ ہے جسے دشمنانِ اسلام کسی قیمت پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے اسی وجہ سے ہر کچھ دن کے بعد کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو مشتعل کر دینے والا کوئی واقعہ بپا کر دیا جاتا ہے جس سے ہر طرف (TENSION) ذہنی تناؤ اور کشیدگی پھیل جاتی ہے اور دونوں فریقوں کا موڈ بُری طرح بگڑ جاتا ہے۔

میں نے اپنی گفتگو کے شروع میں کہا تھا کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے عام مسلمانوں کو جو جذباتی محبت ہے، اسلام دشمنوں نے اکثر اسے اپنے اس مذموم مقصد کے لیے نہایت کامیابی اور عیاری کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ہمیں اس بارے میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ سلمان رشدی والا قضیہ بھی دراصل اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اب آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر بتائیے کہ آپ کی رائے میں سلمان رشدی کی اس شیطنت کے بارے میں مناسب طرزِ عمل کیا تھا؟ آیا یہ کہ اس کے خلاف شور بپا کیا جائے، ہنگامے کیے جائیں، مظاہرے کیے جائیں؟ یا یہ کہ اسے پوری طرح نظر انداز کر دیا جائے اور پوری یکسوئی اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنا کام دعوت الی اللہ جاری رکھا جائے؟؟؟

پہلے طریق کار میں دل کی بھڑاس نکل جائے گی، جذبات کی تسکین بھی ہو جائے گی، چاروں طرف سے شاباش بھی خوب ملے گی، البتہ دشمن کو ہماری کم عقلی پر ایک بار پھر ہنسنے کا موقع ملے گا --- اور دوسرے طریق کار میں دل پر پتھر رکھنا ہوگا، جذبات کی قربانی دینی ہوگی، بزدلی اور بے حسی کے طعنے بھی سننے پڑیں گے، البتہ اسلام کا بھلا ہوگا، دین کو تقویت پہنچے گی،

دشمن ناکام اور اس کا حوصلہ پست ہوگا، اور سب سے بڑھ کر اللہ راضی ہوگا اور اس کے رسولؐ کی منشا پوری ہوگی۔

سیرت نبویؐ کے ایک واقعہ سے ہمیں زیر بحث مسئلہ میں راہنمائی مل سکتی ہے۔ ایک مرتبہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثار صحابی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، کچھ اوباش کافروں نے آپؐ کو گالیاں دینی شروع کر دیں، کچھ دیر تک تو صدیق اکبرؓ بھی خاموش رہے لیکن بالآخر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، ناموس رسولؐ کی اس طرح بے آبروئی صدیق اکبرؓ سے دیکھی نہ گئی، پست کردار اوباشوں کو مخاطب کر کے کچھ کہہ دیا، مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایکدم سے اٹھ کر چل دیئے، صدیق اکبرؓ تعجب سے پوچھا یا رسول اللہ! جب تک میں خاموش رہا آپ نے مجھے اپنے قرب سے محروم نہیں فرمایا لیکن جیسے ہی میں بولا آپ اٹھ کر چل دیئے! یہ کیا ماجرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں ابوبکر! جب تک تم خاموش تھے ایک فرشتہ تمہاری طرف سے جوابدہی پر مامور تھا، لیکن جب تم بول پڑے تو وہ فرشتہ تمہارے پاس سے چلا گیا، سو میں بھی چلا آیا۔

یاد رکھیے! اس قسم کی بیہودہ شیطانی بکواس کا بہترین جواب موجودہ حالات میں یہی ہے کہ خاموش رہا جائے۔ لیکن ایسے موقعوں پر خاموش رہنا بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ خدا کرے کہ موقع محل کی تمیز اور جہاں خاموشی بہتر ہو وہاں اپنے جذبات پر قابو رکھنے اور خاموش رہنے کی عادت یہ دونوں چیزیں سیکھنے کی ضرورت کا ہمیں خاطر خواہ احساس ہو جائے۔

ابھی میں نے آپ سے اس ڈرامے کے صرف ایک کردار (سلمان رشدی) کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ ڈرامے کے دوسرے کردار آیۃ اللہ خمینی کے رول کی وضاحت بھی کافی تفصیل طلب ہے۔ اور اگرچہ کمزوری و نقاہت کے باعث میں بہت تھک چکا ہوں، تاہم اس سلسلہ میں بھی کچھ نہ کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

صورتحال یہ ہے کہ مکہ میں ایران کی ناکام شورش، پھر اچانک ایران عراق کی جنگ بند ہونے کے بعد سے اور امریکہ و اسرائیل کے ساتھ ایران کے خفیہ تعلقات کا راز فاش ہو جانے کے بعد سے خمینی صاحب کی مقبولیت میں تیزی سے کمی آگئی تھی اور ان کی امامت کے غبارہ کی ہوا نکل چکی تھی، لیکن اسلام دشمن طاقتوں کو ایران سے ابھی جو مزید کام لینا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ اس غبارہ میں پھر سے ہوا بھر دی جائے اور خمینی صاحب کو دوبارہ امام المسلمین کے مقدس منصب پر جلوہ افروز کیا جائے اور پھر جس وقت سارا عالم اسلام خمینی صاحب کی جرأت و ہمت اور اسلامی غیرت پر خوشی سے تالیاں بجا رہا ہو اور عقیدت کے پھول برسا رہا ہو، ٹھیک اسی وقت ایران سے افغانستان اور پاکستان میں اسلام کی قبر کھودنے کا کام اس مہارت سے لیا جائے کہ سلمان رشدی کے قضیہ کے شور میں کسی کا ذہن بھی اس طرف منتقل نہ ہو سکے۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں صدر ضیاء الحق کی شہادت سے لے کر اب تک جو کچھ ہو رہا ہے اس میں شیعوں اور قادیانیوں کا کردار سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اور افغانستان میں گیارہ سالہ بے مثال قربانیوں پر خطِ تنسیخ پھیر دینے اور لاکھوں شہیدوں کا خون ضائع کر دینے کی جو منحوس کوشش اس وقت آیۃ اللہ خمینی کی قیادت میں ایران کر رہا ہے وہ اسلام دشمنوں کے

منشاء کے ہی نہیں، شیعوں کی تاریخ کے بھی عین مطابق ہے۔

لیکن افسوس کہ بحیثیت مجموعی مسلمانوں پر جو خداوندی سزائیں مسلط ہیں اُن میں سے ایک ان میں عقل و شعور کا فقدان اور یادداشت کی بے حد کمزوری بھی ہے۔ نسوا اللہ فانساھم انفسھم

مسلمانوں کو یہ نہیں یاد رہا کہ سلمان رشدی کو سبِ رسولؐ کے جرم میں واجب القتل قرار دیئے جانے والا شخص خود کس حد تک اس جرم سے بری ہے؟ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے دنیا بھر کے اخبارات و رسائل میں خمینی صاحب کا یہ بیان چھپا تھا کہ:

"پیغمبرِ اسلام بھی مکمل اور مثالی اسلامی انقلاب برپا نہیں کر سکے تھے، اس لیے کہ ان کو وہ مخلص ساتھی نہیں ملے جن کی اس عظیم کام کے لیے ضرورت تھی۔"

اسی بیان میں خمینی صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ:۔

"ہم وہ انقلاب برپا کر کے دکھائیں گے جسے (نقلِ کفر کفر نباشد) پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی برپا نہیں کر سکے تھے۔"

خدارا کوئی بتائے! اس سے بڑی بھی کوئی گستاخی فخرالرسل اور امام الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں کی جا سکتی ہے؟ صحابہ کرامؓ کے متعلق خمینی صاحب کے جو خیالات ہیں، ان کا بھی ظاہر ہے کہ اصل نشانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہی ہے۔

مسلمانوں کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ جو شخص اس وقت ساری دنیا کے مسلمانوں کا (بزعم خود) ترجمان بن کر کھڑا ہوا ہے، اس کے اپنے خیالات کیا ہیں، اس کا کردار کیا ہے، اسلام دشمنوں سے اس کے روابط کس قسم کے ہیں؟ اس کے حقیقی عزائم اور منصوبے کیا ہیں؟

ادھر کچھ دنوں سے روس اور ایران کے درمیان براہِ راست بات چیت کی خبریں آرہی تھیں، ایران کے وزیر خارجہ روس گئے، کچھ اور اعلیٰ سطحی ایرانی حکام بھی روس کے دورہ پر گئے۔ اور اب آخر میں روسی وزیر خارجہ نے ایران کا جو دورہ کیا ہے اس کا مقصد یہ بتایا ہے کہ برطانیہ اور ایران کے مابین ثالثی کی روسی پیشکش پر تبادلۂ خیال تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں تو مشہور یہی ہے کہ برطانیہ اس مغربی بلاک کا اہم ترین ملک ہے جو بنیادی طور پر روس کا حریف ہے، اور ایران میں بھی مرگ بر امریکہ کے ساتھ مرگ بر روس کے نعرے زور شور سے بلند ہوتے رہے ہیں پھر بھی یہ پوچھنے کی ضرورت کسی نے نہیں سمجھی کہ دو دشمنوں کے درمیان ثالثی کا کام ایک ایسا تیسرا ملک کیسے کر رہا ہے جس سے دونوں کے تعلقات اچھے نہیں ہیں؟

شاباش! دجالی سیاست کے لیڈرو! شاباش! ساری دنیا کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش میں تم مسلسل کامیاب ہو رہے ہو! روسیوں اور ایرانیوں کے درمیان افغانستان میں آخری وار کے لیے تفصیلی اور براہِ راست بات چیت

کی ضرورت تھی، مگر اس کے لیے کوئی ایسا عنوان درکار تھا جس کو سامنے رکھ کر ساری دنیا کو خصوصاً مسلمانوں کو بیوقوف
بنایا جاسکے۔ لہٰذا طے یہ ہوا کہ سلمان رشدی کی اس کتاب کی حمایت کا بیڑا برطانیہ اٹھائے اور مخالفت کا علَم ایران بلند کرے،
پھر اس قضیہ کو لے کر دونوں ملکوں میں تُو تُو میں میں ہو اور پھر روس دونوں کے درمیان بیچ بچاؤ کے بہانے کو دے اور
اس طرح روسی استادوں کو اپنے ایرانی شاگردوں کو خاص کر پاکستان اور افغانستان میں تخریبی کارروائیوں کے مجوزہ
نقشۂ عمل کے بارے میں تفصیلی ہدایات دینے کا اطمینان سے موقع مل جائے۔

اسلام کے دشمن اکثر ایک تیر سے کئی شکار کرتے ہیں۔ سلمان رشدی کے اس قضیہ سے اولاً تو مسلمانوں اور دنیا کے
عام انسانوں کے درمیان منافرت کے جذبات بڑھانے کا کام لیا گیا، پھر آیۃ اللہ خمینی کی "رجعت" کا کام بھی اس قضیہ سے
لیا گیا، اور اب اسی کی آڑ میں ایران اور روس کے درمیان باہم صلاح و مشورہ جاری ہے۔

اب مسئلہ کے پس منظر کے بارے میں ان تمام تفصیلات کو سامنے رکھیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ سلمان رشدی کے اس
قضیہ کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟

یہاں پر میری یہ گفتگو پوری ہوئی تو ان نوجوانوں نے ایک اور سوال کیا۔ سوال یہ تھا: "آپ کی اس گفتگو سے تو ہم یہ سمجھتے
ہیں کہ ہم مسلمانوں کی بے شعوری سب سے بنیادی مسئلہ ہے، آخر اس کا کیا علاج ہے؟"

میں نے اس وقت تو اس سوال کے جواب سے معذرت کی اور کسی دوسری نشست میں اس کا جواب دینے کا وعدہ
کیا۔ ان سطور کے لکھنے سے پہلے وہ دوسری نشست بھی ہو چکی ہے۔ اس نشست میں ان کے اس سوال کے جواب میں جو کچھ
مجھ سے بن پڑا میں نے عرض کیا۔

میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ وہ معروضات بھی "الفرقان" کے ذریعہ آپ سب تک پہنچاؤں یا نہیں؟ اگر آپ اپنی
رائے سے مجھے مطلع فرمادیں تو مجھے فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی۔ ع

یار زندہ صحبت باقی

(بشکریہ "الفرقان" لکھنؤ، مارچ ۱۹۸۹ء)

بقیہ صـ۳۶ : امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا نظریۂ انقلاب و سیاست

وضع کردہ قوانین کے مجموعے نے حکومت کے باضابطہ آئین کی حیثیت اختیار کر لی۔ جو ۵۳۰ سال تک ملک کی دستوری حیثیت سے
نافذ العمل اور جاری رہا۔ پھر دنیائے انسانیت کے گوشہ گوشہ میں اس کی مسلّم قانونی حیثیت اور فضل و تفوق کے پیش نظر
عملاً نافذ کیا جاتا رہا۔ یہ ابوحنیفہ ہی کی عظیم حکیمانہ سیاست، حکمت عملی اور جامع منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ کہ آج دنیا میں
ان کے پیروکاروں اور آئینی کاوشوں پر عمل کرنے والوں کی تعداد دوسرے مذاہب و مسالک کی نسبت سے دو تہائی بڑھ کر ہے

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔
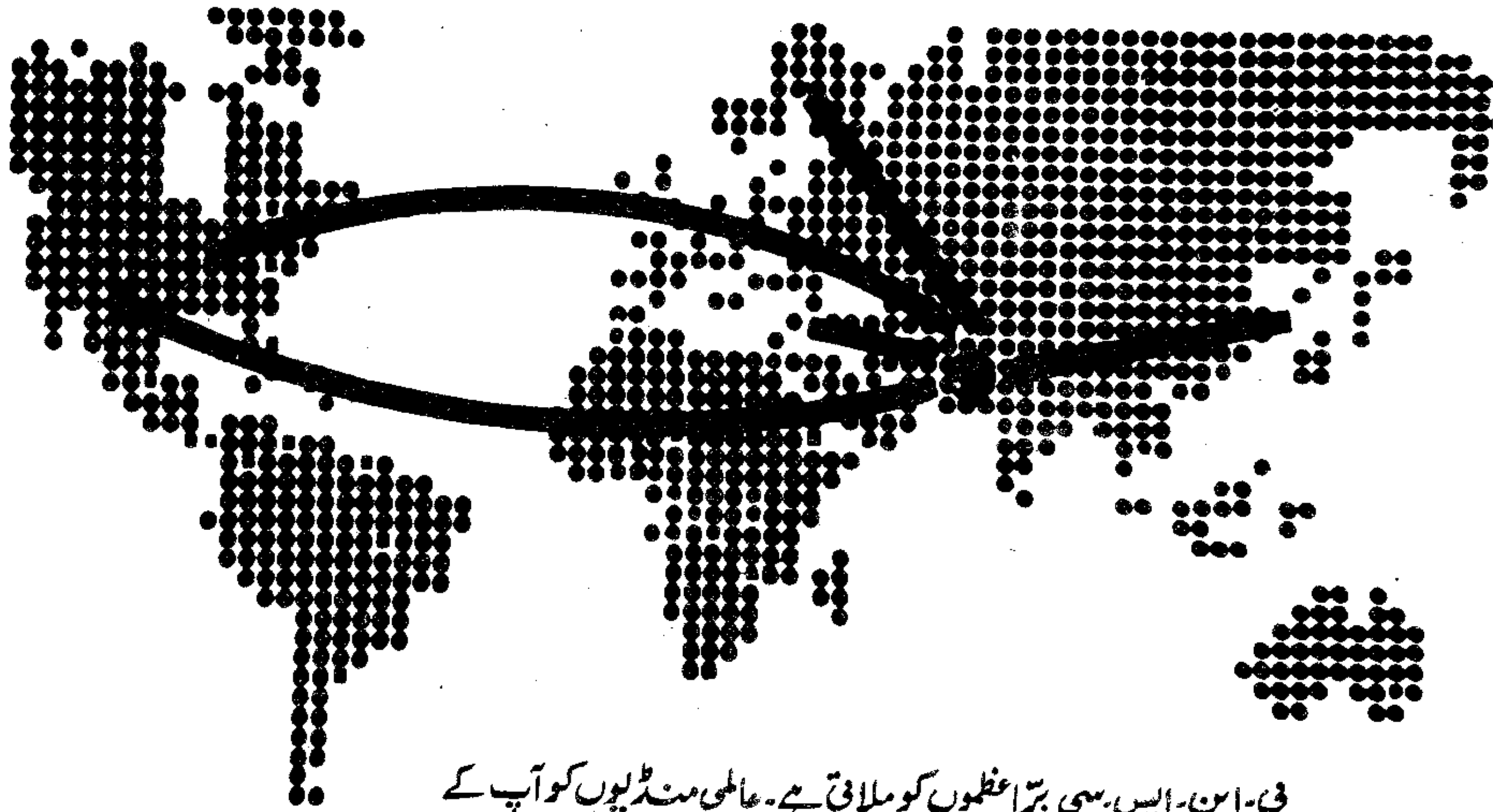
پی- این- ایس- سی برّاعظموں کو ملاتی ہے۔ عالمی منڈیوں کو آپ کے
قریب لے آتی ہے۔ آپ کے مال کی بروقت، محفوظ اور باکفایت ترسیل
برآمدکنندگان اور درآمدکنندگان، دونوں کے لئے نئے مواقع فراہم کرتی ہے۔
پی- این- ایس- سی قومی پرچم بردار - پیشہ ورانہ مہارت کا حامل
جہاز راں ادارہ، ساتوں سمندروں میں رواں دواں

قومی پرچم بردار جہاز راں ادارے کے ذریعہ مال کی ترسیل کیجئے
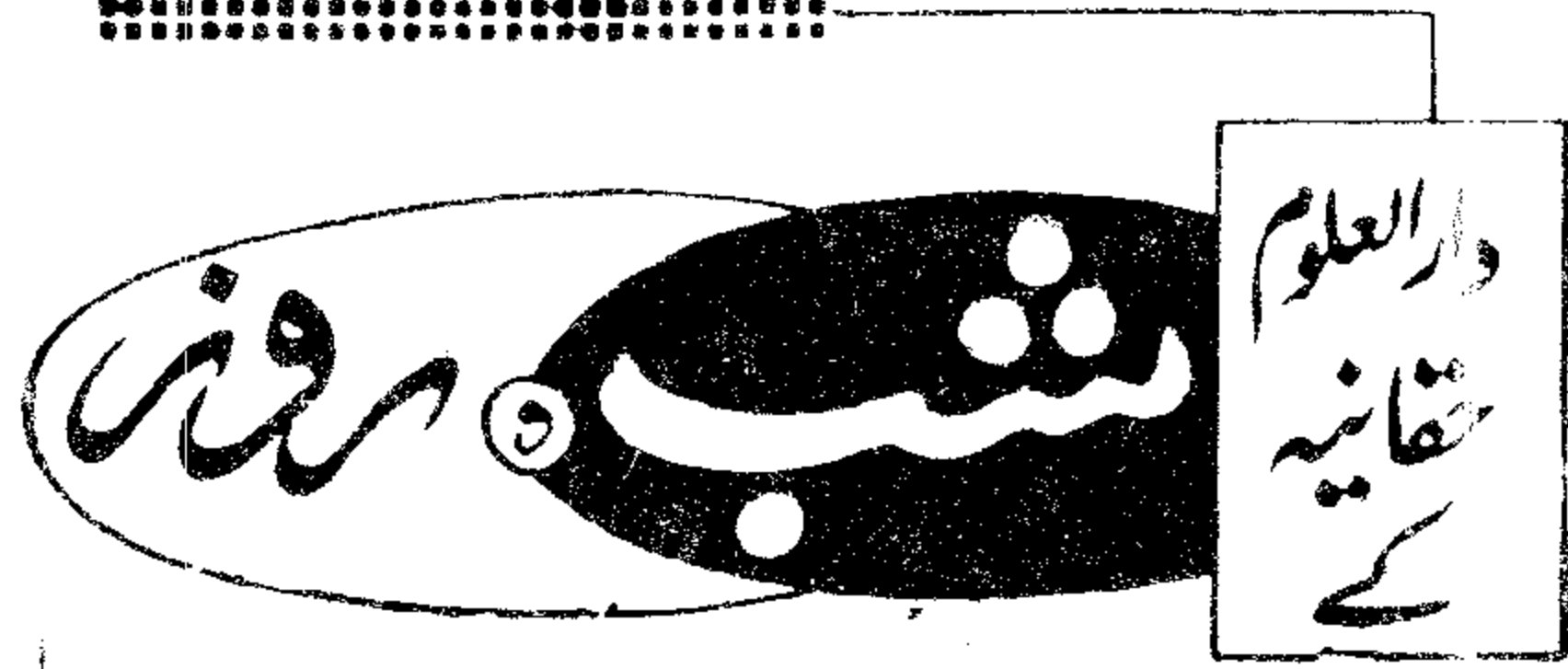
PNSC 2 88 PID - Islamabad

PARAGON

شفیق الدین فاروقی

رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل جناب دکتور عبد اللہ عمر نصیف اور افغان عبوری حکومت کے صدر جناب پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی کی دار العلوم تشریف آوری

۲ / جون ۱۹۸۹ء بروز جمعہ ! رابطہ عالم اسلامی کے مرکزی سیکرٹری جنرل جناب دکتور عبد اللہ عمر نصیف جب گذشتہ دنوں پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تو انہوں نے از خود مرکزِ علم دار العلوم حقانیہ کے تعارفی اور مطالعاتی دورہ اور دار العلوم کے مہتمم مولانا سمیع الحق مدظلہ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ——— عرب علماء، سکالروں اور اپنے رفقاء سمیت دار العلوم حقانیہ حاضر ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا سمیع الحق مدظلہ اور دار العلوم کے اکابر اساتذہ و مشائخ نے ان کی تشریف آوری کو دار العلوم کی علمی و دینی خدمات اور بین الاقوامی سطح پر اس کا اعتراف قرار دیتے ہوئے اسے خوش آئند قرار دیا۔ چنانچہ موصوف حسب وعدہ معینہ وقت پر بروز جمعۃ المبارک تقریباً ایک بجے دار العلوم حقانیہ تشریف لائے تو دار العلوم کے مہتمم مولانا سمیع الحق، نائب مہتمم مولانا حافظ انوار الحق، طلبہ و اساتذہ، اکابر علماء، معززینِ شہر اور جمعیۃ علماء اسلام کے مرکزی و پارلیمانی راہنماؤں مولانا قاضی عبد اللطیف سینیٹر، مولانا شہید احمد ایم این اے، مولانا نعمت اللہ ایم این اے نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ طلبہ نے دو رویہ کھڑے ہو کر استقبالیہ فلک شگاف نعروں سے اضیافِ مکرم کے لیے دیدہ و دل بچھا دیے۔

جناب دکتور عبد اللہ عمر نصیف کے ارکانِ وفد میں افغان عبوری حکومت کے صدر جناب پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی، جناب شیخ عبد المجید زندانی وزیر الیمنی، جناب شیخ فتحی مصری کے علاوہ کئی ایک نامور عرب سکالر اور دانشور بھی شامل تھے ——— مہمانوں نے مولانا سمیع الحق مدظلہ کی معیت و راہنمائی میں سب سے پہلے تعلیم القرآن حقانیہ ہائی سکول کا معائنہ کیا۔ نصاب تعلیم، طلبہ کی تربیت، اساتذہ کا تعلیمی طریق کار اور طلبہ کی دینی شکل و صورت اور ذہانت اور نظم و ضبط دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور اپنے مختصر خطاب میں انہیں بڑے حوصلہ افزا کلمات سے نوازا ——— وہاں سے فارغ ہوئے تو دار العلوم کے مختلف شعبہ جات، دفتر اہتمام، دار الافتاء، مؤتمر المصنفین، ماہنامہ الحق، شعبہ تخصص فی الفقہ، دار الحفظ والتجوید کا اجمالی معائنہ

فرمایا۔ ہر جگہ سادگی، کفایت شعاری اور خالص اسلامی رنگ کے غلبہ اور دینی نہج پر حیرت و استعجاب کے ساتھ ساتھ بڑے اطمینان، مسرت اور کمال سرور کا اظہار فرماتے رہے۔

معزز مہمان ڈیڑھ بجے جامع مسجد دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے تو مسجد میں دارالعلوم کے طلبہ اور عامۃ المسلمین کا عظیم اجتماع بن چکا تھا۔ مسجد، صحنِ مسجد، باہر کے چمن کھچا کھچ بھر چکے تھے، مسجد کو اپنی وسعتوں کے باوجود تنگدامنی کی شکایت تھی ——— دارالعلوم کے مہتمم مولانا سمیع الحق مدظلہ، نے اولاً مہمانوں کا تعارف کرایا اور پھر اضیاف کی دارالعلوم تشریف آوری پر ان کا عربی زبان میں بھرپور شکریہ ادا کیا، اور جناب ڈکتور عبداللہ عمر نصیف کو خطاب کی دعوت دی، انہوں نے اپنے مفصل خطاب میں مرکزِ علم دارالعلوم حقانیہ کی عظیم دینی و تاریخی خدمات بالخصوص جہادِ افغانستان میں مرکزی کردار کو ایک لازوال تاریخی کارنامہ قرار دیا۔ اور اب کے سیاہ انقلاب میں مولانا سمیع الحق کی دینی اور اسلامی مساعی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

افغان عبوری حکومت کے سربراہ مولانا پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی نے اپنے عربی خطبۂ جمعہ میں جہادِ افغانستان کی تازہ ترین صورتِ حال، مسلمان ممالک کی ذمہ داریاں، پاکستان کی حالیہ حساس ذمہ داری، دینی قوتوں کی بیداری، دارالعلوم حقانیہ کے فضلاء کا جہاد میں مرکزی کردار اور اس سلسلہ میں مستقبل کے عزائم پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مولانا سمیع الحق مدظلہ، کی دعوت پر نمازِ جمعہ بھی حضرت مجددی صاحب مدظلہ نے پڑھائی۔

نمازِ جمعہ کے بعد مولانا سمیع الحق مدظلہ نے دارالعلوم کے مہمان خانہ میں اضیافِ محترم کو ظہرانہ دیا۔ اور اس موقعہ پر عالمِ اسلام کے اہم ترین مسائل بالخصوص جہادِ افغانستان اور پاکستان کی حالیہ نازک ترین سیاسی صورتِ حال پر تفصیل سے تبادلۂ خیال کیا۔

اس موقعہ پر رابطہ عالمِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل جناب ڈکتور عبداللہ عمر نصیف اور افغان عبوری حکومت کے سربراہ جناب پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی نے جو خطابات فرمائے وہ آئندہ شمارے میں عربی مع اردو ترجمہ پیش کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ

نذرانۂ عقیدت

بحضور قائدِ شریعت

قاضی عبد الحلیم کلاچوی
نائب مہتمم مدرسہ عربی نجم المدارس کلاچی

حضرت اقدس امیر المومنین فی الحدیث امیر شریعت حضرت شیخؒ پر آج سے ٹھیک تیرہ[۱۳] برس قبل جب کہ احقر مادرِ علم حقانیہ میں حضرت کے پاؤں میں بیٹھتا تھا۔ اس وقت کا قصیدہ مدحیہ ہے۔ پرانے کاغذات میں ایک بوسیدہ خدام الدین کے ٹائیٹل (آخری صفحہ) پر شائع شدہ صورت میں مل گیا۔ پرانی یاد تازہ ہوگئی - اور حقانیہ کے لیل ونہار آنکھوں میں گھومنے لگے اور حال کچھ اس طرح کا ہوگیا جس کی تصویر عربی شاعر نے اس طرح کھینچی ہے! ؎

وجرالدمع یجری بالتلاق وبدر ابصر یجری فی المحاق
وللأخر بالقلب اجتماع بیناوی ابہ رحیّ علی الفراق

مسندِ علم وعمل کا پاسباں تُو ہی تو ہے گلشنِ دین وادب کا پاسباں تُو ہی تو ہے
پیکرِ حلم وحیا کہنا تجھے ہی زیب ہے یادگارِ حضرت عثمانؒ اب تو ہی تو ہے
پست و بالا کے لیے یکساں تیری ذات ہے ہر کسی کا ایک سا مشفق رہا تُو ہی تو ہے
تیری مجلس میں نہیں دیکھا تمیزِ رنگ و بُو کل جہاں کا ایک سا ابرِ کرم تُو ہی تو ہے
درس تیرے میں بھرا ہے رنگ انور شاہؒ کا شیخ مدنیؒ کی امانت کا امیں تُو ہی تو ہے
تُو نے سکھلائے ہمیشہ علم وحکمت کے رموز دورِ حاضر کا غزالی سب کے ہاں تُو ہی تو ہے
تُو نے سمجھائے ہمیشہ دین و دانش کے اصول فقہ حنفی کا حقیقی ترجماں تُو ہی تو ہے
دل سے کہتا ہوں تصنع سے تجھے صد بیر ہے ظلمتوں میں شمع کافوری رہا تُو ہی تو ہے
ہاں نہیں ہے آج تیری فقہ و دانش کی مثال فقہ نعماں کا امیں اور خوشہ چیں تُو ہی تو ہے
انقلابی قافلہ سوئے حرم اب ہے رواں "قالبِ محمودؒ" میں روحِ رواں تُو ہی تو ہے
صد سکوں مجھ کو میسر ہے تجھے کو دیکھ کر جس کا ہر قول وعمل اور ہر ادا تُو ہی تو ہے
تُو نے قائم کردیا ہے اپنے ہاں اک "دیوبند" سب اکابر کی توجہ کی جگہ تُو ہی تو ہے

کاش اس ناچیز پر پڑتی کبھی تیری نظر
میرے سب امراضِ باطن کی دوا تُو ہی تو ہے

مولانا عبدالقیوم حقانی

تعارف و تبصرۂ کتب

جمع الوسائل فی شرح الشمائل (عربی) | تالیف الشیخ العلامہ علی بن سلطان محمد القاری۔ صفحات ۵۰۰۔ قیمت درج نہیں۔ ناشر۔ ادارہ تالیفات اشرفیہ بیرون بوہڑ گیٹ ملتان۔

شمائل امام ترمذیؒ کی وہ گرانقدر تصنیف اور عظیم علمی ذخیرہ ہے جسے ہمیشہ اور ہر دور میں عشق و محبت اور ذوق و اشتیاق سے علمی حلقوں، دینی اور اسلامی اصحاب ذوق کا اعتبار رہا ہے۔ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک، اوصاف حمیدہ، خصائل اور اخلاق و عادات سے متعلق موثق اور مستند روایات جمع کردی گئی ہیں۔ کتاب کو درس نظامی کے درجہ عالیہ میں نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ ارباب علم نے ابتدا سے رواں سے اس کی شرح و توضیح پر توجہ دی اور متعدد شروحات منصہ شہود پر آئیں۔ مگر جو مقام استناد قبول عام اور تحقیق و تشریح کے لحاظ سے حضرت علامہ علی قاری کی "جمع الوسائل" کو حاصل ہوا ہے وہ کسی بھی دوسری شرح کو حاصل نہ ہوسکا۔ جمع الوسائل میں علامہ قاریؒ نے متن حدیث کی شرح و تفسیر لغات کی تحقیق، روایات کی تطبیق اور احادیث سے مستنبط ہونے کی تفصیل شرح و بسط سے بیان فرمائی ہے۔ جو شمائل کے طلبہ، اساتذہ اور عربی دان عام اصحاب ذوق کے لئے بے حد نافع اور مفید ہے پاکستان میں نایاب تھی، کافی عرصہ قبل مصر میں چھپی تھی۔ جناب الحاج اسحاق صاحب مالک ادارہ تالیفات اشرفیہ اس کی فوٹو کاپی لے کر عمدہ کاغذ اور بہترین طباعت کی صورت میں منظر عام پر لے آئے ہیں۔ جمع الوسائل کے حاشیہ پر عظیم محدث علامہ عبدالروف مناویؒ کی شرح بھی چڑھی ہوئی ہے۔ ۵۰۰ صفحات کی اس ایک جلد میں اعلیٰ درجہ کے دو شروحات ارباب ذوق اور اہل علم کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں یقیناً اہل علم اس کی بھرپور قدر کریں گے۔

معالم العرفان فی دروس القرآن | افادات حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی، ضبط و ترتیب الحاج لعل دین ایم اے۔ صفحات ۶۸۴۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔ ناشر مکتبہ دروس القرآن۔ محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ۔

"معالم العرفان" حضرت العلامہ مولانا صوفی عبدالحمید صاحب مدظلہ کے درس قرآن کے ضبط و تحریر اور اشاعت کا مقبول عام سلسلہ ہے جس کی کئی ایک جلدیں اور ہر جلد کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پیش نظر

کتاب اسی سلسلہ کی تیسری جلد ہے جس میں سورہ آل عمران کے دروس کو ضبط و تحریر میں لایا گیا ہے۔ انداز بیان سلیس عام فہم ہے جس میں قرآنی اسرار و رموز، تفسیری نکات، فقہی مسائل اور عقائد اور متعلقہ مضامین کو بڑے سلیقے اور تبلیغ و دعوت کے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

مرتب جناب لعل دین صاحب نے جس ہنرمندی سے تسوید اور ترتیب و تحریر کا صعب ترین اور محتاط کام حسن سلیقہ سے انجام دیا ہے اس پر وہ قرآنی ذوق رکھنے والے تمام احباب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ یہ سلسلہ درس قرآن علماء، واعظین، خطباء، مدرسین، مبلغین اور عام لکھے پڑھے احباب کے لئے یکساں طور پر مفید ہے اور قیمت بھی معقول ہے۔

مولانا آزادؒ کی قرآنی بصیرت تالیف شیخ التفسیر مولانا اخلاق حسین قاسمی۔ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت ۵۴ روپے۔ ناشر۔ سنی پبلی کیشنز۔ عزیز مارکیٹ۔ اردو بازار۔ لاہور ۲۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کا نام آسمان سیاست پر ایک منور ستارے کی مانند ہے آپ کی اس شہرت کی وجہ سے عام آدمی یہ یقین کرنے کو آمادہ ہی نہیں کہ وہ مولانا آزادؒ کو ایک مفسر قرآن یا علوم دینیہ کا امام تسلیم کرے اور تحریک دعوت قرآن کا امام مانے مگر زیر نظر کتاب اسی بات کا اظہار اور تعارف ہے کہ مولانا آزاد کو تفسیر قرآن میں ایسا ملکہ و کمال حاصل تھا اور آپ نے ایسی جامع تفسیر لکھی جس میں حدیث و سنّت کا پختہ رنگ، ائمہ حدیث جیسی باریک نظر، تصوف و معرفت کی چاشنی اور اردو ادب کا ایسا بلیغ انداز موجود ہے جو ہر صاحب علم کو تحیر میں مبتلا کر دے۔ پھر عقلی مسائل کا استدلال سائنسی اور جدید ہے جو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے پرکشش اور جاذب ہے۔

مولانا آزادؒ نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن اس دور میں تحریر فرمائی جو کافرانہ آمریت اور جبر و استبداد کا دور ہے جس میں مسلمانوں کے عقائد و نظریات میں جمود کی کیفیت غالب ہے۔ مگر مولانا اس تفسیر کے ذریعہ امت خفتہ کے افراد کو بیداری کی دعوت دیتے اور عظمت رفتہ کے حصول کے لئے کمربستہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس تفسیر پر مختلف طبقات نے اعتراض کئے اور اس سے مسلمانوں کو دور رکھنے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشے۔ اسی کے پیش نظر مولانا آزادؒ نے تفسیر ترجمان القرآن کی خصوصیات سے باخبر کرنے کے لئے اہل علم سے اپیل کی تھی کہ " دور حاضر کی تفاسیر اور ترجمان القرآن کا موازنہ اہل علم کریں " اور پھر خود ہی ایک مقام پر اظہار تاسف بھی کیا کہ " اتنی زحمت کوئی کیوں برداشت کرے گا؟

مولانا آزادؒ کی اس اپیل پر دور حاضر کے مفسر قرآن، شاہ ولی اللہؒ کے مدرسہ رحیمیہ کے متولی اور قرآنی رموز و اسرار پر بالغ نظر رکھنے والے مولانا اخلاق حسین قاسمی نے قلم اٹھایا اور زیر نظر کتاب "مولانا آزادؒ کی قرآنی بصیرت"

کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ تحریر فرمایا جس میں مولانا محترم نے ترجمان القرآن کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور پھر ترجمان القرآن کی خصوصیات کو قلم بند کیا خصوصاً تفاسیر قدیم و جدیدہ میں مولانا آزادؒ کی انفرادیت اور اس کے اسباب، مولانا کے انداز تحریر کی جدت و ندرت طریق استدلال اور دیگر نکات پر فنی گفتگو فرمائی ہے۔

سال رواں جو آزاد صدی کے حوالہ سے ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس میں اس کاوش کو قرآنی علوم کے طلبار کے نام معنون کرتے ہوئے ملک کے معروف اشاعتی ادارے "سنی پبلی کیشنز لاہور" نے سفید اعلیٰ کاغذ پر خوبصورت کتابت اور انداز میں شائع کیا ہے۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی تصنیفات اس کے علاوہ بھی اہل علم سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مگر یہ تالیف ایک اچھوتا اور نرالا انتخاب ہے جو ہر صاحب علم کے لئے علم و عرفان کا خزینہ اور غور و فکر کے لئے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس تالیف کو اہل علم اور عوام کے لئے نفع کا باعث بنائیں۔ آمین

عورت کی سربراہی کا مسئلہ (مجموعہ مقالات)	ضخامت ۱۲۴ صفحات۔ قیمت ۱۵ روپے۔ باہتمام مولانا محمد نعیم اللہ فاروقی خطیب جامع مسجد زینب۔ بلند روڈ لاہور ۲۵

چودہ سو سال سے علمار امت میں اجماع ہے کہ "عورت سربراہِ مملکت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی"۔ مگر کچھ آوارہ خیال دانشوروں نے علمائے کرام کو مطعون کرنے کے لئے ایک منظم مہم چلائی اور عوام الناس میں یہ بات شائع کرنے کی ناپاک کوشش کی کہ اسلام کے مختلف ادوار میں عورتوں کو سربراہِ مملکت بنایا گیا۔ اور نہایت رکیک قسم کے اعتراضات حدیث مبارک لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ پر کئے جن کے جواب میں ملک کے اکابر علماء نے مقالے تحریر فرمائے۔ جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ ضرورت تھی کہ وہ مقالات یکجا شائع ہو کر عامۃ الناس کے سامنے آجائیں۔ اس ضرورت کو برادر محترم مولانا محمد نعیم اللہ فاروقی صاحب نے پورا کر دیا۔ انہوں نے تین اکابرین حضرت مولانا مفتی محمد ولی حسن، حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کی رشحات قلم کو شاملِ اشاعت کیا ہے۔

مجموعہ مقالات کی اشاعت ہر لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ ادارہ اپنے قارئین سے التماس کرتا ہے کہ اس "مجموعہ مقالات" کو خود بھی خریدیں اور دیگر احباب کو بھی رغبت دلائیں تاکہ عامۃ الناس میں اپنی ذمہ داری کا شعور بیدار ہو۔

محفوظ، قابلِ اعتماد، مستعد بندرگاہ

بندرگاہ کراچی

جہازرانوں کی جنّت
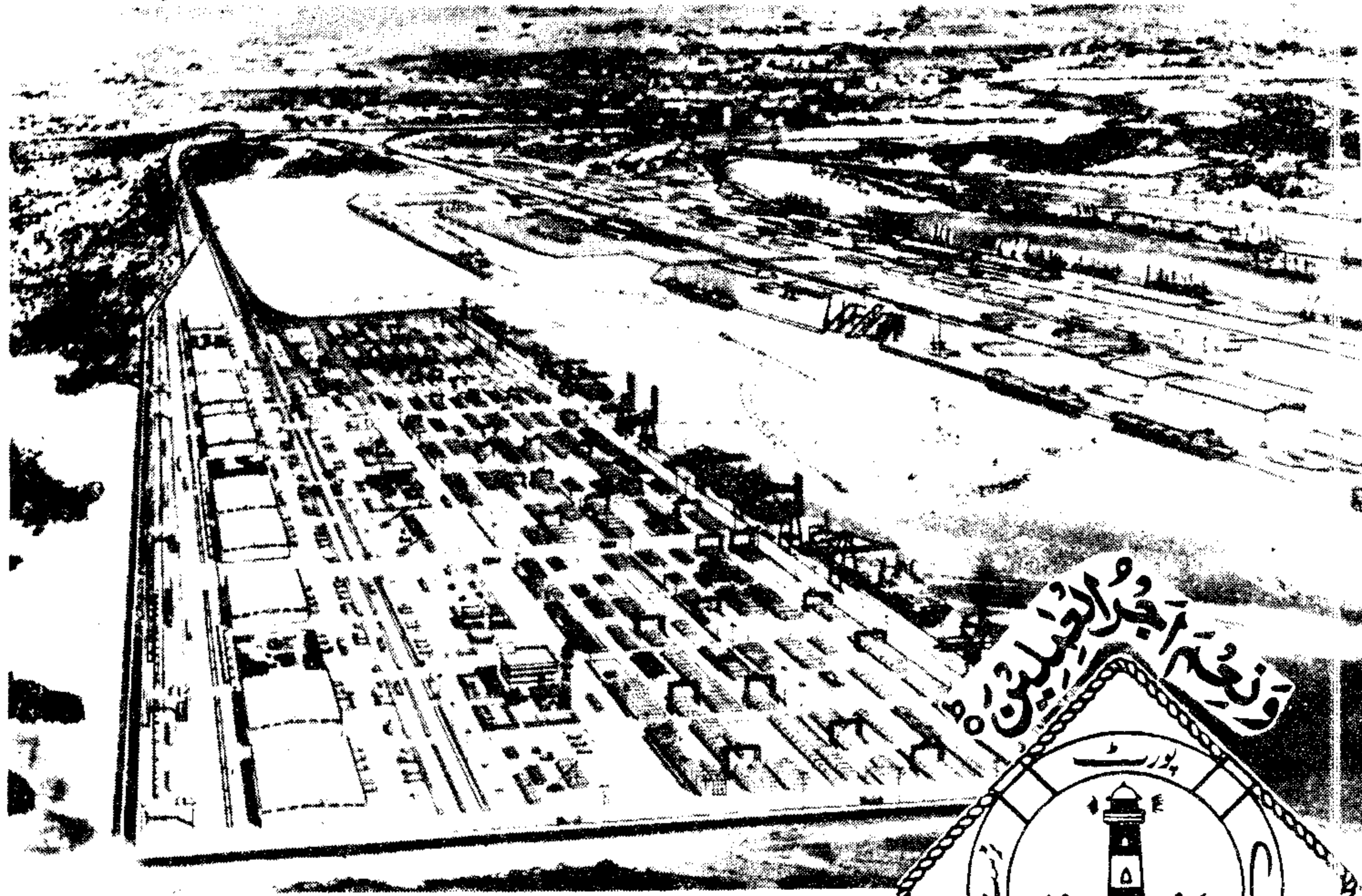
بندرگاہ کی خدمات کے جدید انداز کے ساتھ
عالمی تجارت کے لئے پُرکشش
پاکستانی معیشت کی تعمیر کے لئے کوشاں

ہماری کامیابیوں کی بنیاد

- انجنیئرنگ میں کمالِ فن
- جدید ٹیکنالوجی
- مستعد خدمات
- باکفایت اخراجات
- مسلسل محنت

۲۱ ویں صدی کی جانب رواں

بمع

جدید مربوط کنٹینر ٹرمینلز
نئے میرین پروڈکٹس ٹرمینل
بندرگاہ کراچی ترقی کی جانب رواں